مذاہب عالم کا تقابلی مطالعہ

علامہ نیاز فتح پوری

آواز اشاعت گھر
الکریم مارکیٹ، اردو بازار، لاہور

ظفر اقبال نائب صدر نے
عالمین پریس سے چھپوا کر
آواز فاؤنڈیشن برائے تعلیم سے شائع کی۔
قیمت 70 روپے

فہرست مضامین

۱۔ تعارف

۲۔ عرض حال ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ۵

۳۔ تاریخ مذاہب ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ۱۳

۴۔ مذاہب تاریخی ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ۱۸

۵۔ مذاہب الہند ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ۲۳

۶۔ مذاہب امریکہ ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ۲۶

۷۔ مذاہب عجم ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ۲۹

۸۔ یورپ ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ۳۳

۹۔ مسیحیت ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ۳۶

۱۰۔ فنیقیہ ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ۴۸

۱۱۔ بابل ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ۵۰

۱۲۔ قوم حطی ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ۵۲

۱۳۔ فریجیہ ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ۵۲

۱۴۔ مصر قدیم ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ۵۴

۱۵۔ ایران قدیم ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ۵۵

۱۶۔ یونان قدیم ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ۵۶

۱۷۔ مرکر زندہ ہونے کا اصلی مطلب ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ۶۰

۱۸۔ یسوع ناصری کی اصل حقیقت ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ۶۱

۱۹۔ مذاہب سے انحراف ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ۶۵

۲۰۔ مذہب کا مستقبل ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ۷۷

۲۱۔ ظہور اسلام ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ۸۰

عرض حال

تاریخ تمدن انسانی پر جس وقت غور کیا جاتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ ہر طلوع آفتاب کے ساتھ انسان کا قدم ترقی کی طرف اٹھ رہا ہے اور عقائد مذہبی کی گرفت ڈھیلی ہوتی جا رہی ہے۔ اس لئے یہاں قدرتاً یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا مذہب ترقی کے منافی ہے۔ کیا اس کے اصول انسان کو آگے بڑھنے سے روکتے ہیں اور کیا مذہبی تعلیم' دماغی نشوونما اور ذہنی ارتقاء کا ساتھ دینے سے عاری ہے۔

اس کا جواب ڈھونڈھنے کے لئے زیادہ کاوش کی ضرورت نہیں۔ مذاہب عالم کی تاریخ اٹھا کر دیکھیئے تو آپ کو خود معلوم ہو جائے گا کہ یقیناً" مذہب انسان کی ترقی میں حائل ہے۔ اور اسے ہونا بھی چاہئے کیونکہ مذاہب عالم کی پیداوار نتیجہ تھی صرف مقامی و نسلی اقتضاء کا اور اس کے ذہن میں تمام نوح انسانی کی فلاح و ترقی کا سوال آ ہی نہ سکتا تھا۔ اگر کوئی مذہب ایشیا کے مغرب میں پیدا ہوا تو اسے مشرق کے باشندوں کا حال معلوم نہ تھا اور اگر مشرق میں اس کا نشوونما ہوا تو وہ اہل مغرب کی طرف سے خالی الذہن تھا۔ صرف ایک مخصوص جماعت۔ ایک محدود ملک کی اصلاح کا مقصد ان کے سامنے تھا اور اس لئے قدرتاً" وہ ایسے اصول بنا ہی نہ سکتے تھے جو کرہ ارض کے تمام باشندوں کے لئے ان کے ماحول' ان کی معاشرت اور ان کی طبیعت و مزاج کے لحاظ سے مناسب و ضروری ہوں' میری مراد مذہب سے یہاں صرف وہ چند معتقدات ہیں جن کا تعلق نہ صرف خدا کی ہستی یا مابعد الطبیعات سے ہے بلکہ اس شریعت یا اصول اخلاق اور معاشرت سے بھی ہے جو ایک مذہب کے ماتحت کسی قوم میں رائج ہو جاتے ہیں اور جن کا اصولی اختلاف باہم کشت و خون کا باعث ہوا کرتا ہے۔

دنیا میں سب سے آخری قابل ذکر مذہب' اسلام ہوا ہے جس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ مذاہب کی دنیا میں آخری لفظ کی حیثیت رکھتا ہے لیکن افسوس ہے کہ نہ اپنے

معتقدات دینی کے لحاظ سے وہ سب کے لئے قابل قبول ہے اور نہ شریعت کے اعتبار سے اسے مکمل کہا جا سکتا ہے۔

اس میں شک نہیں کہ دنیا میں جتنے انبیاء ظاہر ہوئے ان سب نے یہی کہا کہ وہ نوع انسانی کی اصلاح کے لئے مبعوث ہوئے ہیں۔ لیکن عملاً وہ اس سے زیادہ کامیاب نہ ہوئے کہ ایک محدود جماعت و مخصوص ملک میں کچھ زمانہ تک تو بیداری ضرور رہی۔ لیکن پھر رفتہ رفتہ وہ فنا بھی ہوگئی۔ اس کا سبب صرف یہی تھا کہ زمانہ کی ترقی کا ساتھ کوئی مذہب نہ دے سکا اور انسان کے ذہن و عقل میں جو نشوونما پیدا ہو رہا ہے اس کے اقتضاء کو وہ پورا نہ کر سکا۔

مذہب نام نہ صرف خالص اصلاح اخلاق کا ہے اور نہ ترقی تمدن و معاشرت کا بلکہ اس میں وہ اعتقادات بھی شامل ہیں جو خدا کی ہستی' اس کی عبادت اور حیات بعدالموت سے متعلق ہیں اور اس لئے ایک مذہب صرف ہمارے اصول معاشرت و اخلاق منضبط کرنے کا مدعی نہیں ہے۔ بلکہ وہ انسان کو اس بات پر بھی مجبور کرتا ہے کہ خدا اور اس کی ہستی کی نسبت بعض متعین و مخصوص عقائد کو تسلیم کرے یعنی وہ عقل انسانی پر بھی حکمرانی کرنے کا دعویدار ہے۔ در آنحالیکہ عقول انسانی میں جو تدریجی ارتقاء پیدا ہو رہا ہے اس کا ساتھ دینے کی اہلیت اس میں نہیں ہے اور غالباً یہی وہ کمی ہے جس کو یوں کہہ کر پورا کیا جاتا ہے کہ "مذہب میں عقل کو کوئی دخل نہیں ہے۔"

ایک طرف ہم کو یہ تعلیم دی جاتی ہے کہ مذہب فطری چیز ہے یعنی عقل انسانی خواہ کتنی ہی ترقی کر جائے۔ مذہب کے اصول و عقائد متزلزل نہیں ہو سکتے۔ اور دوسری طرف یہ تاکید بھی ہے کہ مذہب نام ہے بغیر استعمال عقل کے ان باتوں کے بے چوں و چرا تسلیم کر لینے کا جن کو ہمارے اکابر اسلاف تسلیم کرتے چلے آئے ہیں اور ان دونوں میں جو تضاد و تبائن پایا جاتا ہے۔ وہ کسی سے مخفی نہیں۔

مذہب بالکل مقامی و تمدنی چیز ہے۔ یعنی ایک مخصوص قوم و ملک کے مفاد کو سامنے رکھ کر وضع کیا جاتا ہے۔ اور اس کا قوی ترین ثبوت یہ ہے کہ دنیا میں ہر مذہب سوا اپنے دوسرے کو باطل قرار دیتا ہے۔ یعنی وہ اپنے متبعین میں دوسری اقوام یا دیگر مذہب والوں سے نفرت کا جذبہ پیدا کرتا ہے اور ظاہر ہے کہ اس صورت میں عالم کا امن و سکون اس

سے کسی طرح وابستہ نہیں ہو سکتا بلکہ اس کے برعکس وہ باہمی اختلاف و تصادم پیدا کرنے کا باعث ہوتا ہے۔

ہر چند اس مذہب کی حقیقت کا انکشاف کوئی جدید انکشاف نہیں ہے اور اس سے قبل بھی اس تلخی کا علم لوگوں کو حاصل تھا۔ لیکن چونکہ ترقی تمدن اس حد تک نہ ہوتی تھی کہ تمام کرہ ارض کے امن و سکون اور جملہ نوع انسانی کی مرکزیت کی طرف خیال مجز ہوتا ہے۔ اس لئے چنداں پروا بھی نہ کی جاتی تھی' لیکن اب کہ علمی انکشافات و ذرائع نقل و حمل اور تجارتی و اقتصادی وسعت نے دنیا کے ہر ملک کو دوسرے ملک کا محتاج بنا دیا ہے۔ سب سے بڑا سوال یہی ہے کہ دنیا کا امن و سکون کیونکر قائم رکھا جائے اور باہمی جذبات مخالفت و منافرت کو دور کر کے کسی طرح تمام نوع انسانی کو ایک شیرازہ سے وابستہ کر دیا جائے۔

یقیناً" مذہب اس مقصد کو پورا کر سکتا تھا اگر اس کے عقائد و قانون میں اتنی لچک ہوتی کہ وہ ذہن انسانی کی ترقی کا ساتھ دے سکتا۔ لیکن چونکہ مذہب نام ہے صرف قدامت پرستی کا اور انہیں اصول پر کاربند ہونے کا جو صدیوں اور ہزاروں سال قبل وضع کئے گئے تھے۔ اس لیے وہ اس مقصد کے حصول کا ذریعہ نہیں ہو سکتا اور ایک مذہب پر کیا موقوف ہے۔ اس وقت کوئی نظام عمل جو ذہن انسانی کی تشویش کو دور کرنے اور دنیا میں عام امن و سکون پیدا کرنے کے ناقابل ہے کامیاب نہیں ہو سکتا۔

اب اسی کے ساتھ ایک سوال اور بھی غور طلب ہے۔ یعنی یہ کہ اگر آج دنیا سے مذہب یکسر فنا ہو جائے اور مذہبی عصبیت بالکل محو کر دی جائے تو کیا مدعا حاصل ہو جائے گا۔ اور کیا کرہ ارض کے تمام باشندے ایک دوسرے کے ساتھ بھائی بن کر رہنے لگیں گے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ یقیناً" مدعا اس وقت بھی حاصل نہ ہو گا۔ کیونکہ مذہبیت کے علاوہ دو بلائیں اور نوع انسانی پر نازل ہوئی ہیں۔ ایک امتیاز رنگ و نسل کی اور دوسری جذبہ سرمایہ داری کی۔ یعنی جس طرح مذہب لوگوں میں جذبہ منافرت کی پرورش کر رہا ہے۔ بالکل اسی طرح گورے کالے کے امتیاز اور فراہمی دولت کی حرص نے انسانیت کو پامال کر رکھا ہے۔ چنانچہ امریکہ میں جو سلوک حبشیوں کے ساتھ ہوتا ہے وہ بھی کسی سے مخفی نہیں۔ اور سرمایہ داروں کی طرف سے مزدوروں کی محنت و عرق ریزی کا جو صلہ ملتا

ہے وہ بھی دنیا کو معلوم ہے۔ وہ اہل نظر جن کی نگاہ ان تمام مسائل پر ہے۔ ان میں سے بعض کا خیال یہ ہے کہ رنگ و نسل کا امتیاز بھی مذہب ہی نے پیدا کیا ہے اور سرمایہ دارانہ ذہنیت بھی نتیجہ ہے مزہبیت کا۔ جس نے اخلاق کی آڑ میں سلطنت و حکومت کی بنیادیں قائم کیں۔ اس لئے مذہب کے ساتھ ان کو بھی ختم ہو جانا چاہئے۔ مگر میں اس سے متفق نہیں ہوں اور ان کا جداگانہ امراض تصور کرتا ہوں۔ جن کا علاج بھی بالکل جداگانہ ہونا چاہئے۔ تاہم اس یہ نتیجہ نہیں نکل سکتا کہ جب تک کلیتہ" تمام امراض کے دور کرنے کی صورتیں پیدا نہ ہو جائیں کسی ایک مرض کا بھی مداوا نہ کیا جائے۔ ہو سکتا ہے کہ ایک کا اندفاع دوسری بیماریوں کا مقابلہ کرنے کی اہلیت ہم میں پیدا کر دے اور اس لئے اگر دنیا سب سے پہلے مذہبیت ہی کو دور کرنا چاہتی ہے تو بیجا نہیں جبکہ حقیقتاً" سب سے زیادہ سخت و سنگین مرض یہی ہے۔

اس کے متعلق دنیا میں فی الحال دو قسم کا خیال رکھنے والے لوگ پائے جاتے ہیں۔ ایک وہ جو موجودہ مذاہب میں اصلاح کر کے کسی ایک عالمگیر مذہب کی بنیاد ڈالنا چاہتے ہیں اور دوسرے وہ جو سرے سے مذہب کے خیال ہی کو محو کر دینا پسند کرتے ہیں۔ ان میں اول الذکر صورت یقیناً" بہتر ہے، لیکن تقریباً" ناممکن العمل۔ دوسری صورت البتہ زیادہ آسان ہے اور لوگوں کے موجودہ رجحان کو دیکھتے ہوئے یقین کرنا پڑتا ہے کہ چند صدی کے بعد مذہب تو یقیناً" ختم ہی ہو جائے گا گو سرمایہ و عمل کی جنگ اور رنگ و نسل کا امتیاز علی حالہ قائم رہے گا۔

دنیا میں اور بہت سے ملک ہیں۔ لیکن اس باب میں پاکستان سے بدبخت کوئی نہیں اور مذہب و مذہبیت کا استعمال جس بری طرح یہاں کے لوگوں نے کیا ہے۔ اس کی مثال اس وقت نہیں مل سکتی، لیکن سوال یہ ہے کہ اس طرف توجہ کون کرے آیا مولویوں کی وہ جماعت جس کے وجود نے یہاں کی فضا کو اس قدر پراگندہ کر رکھا ہے یا ہماری موجودہ نسل کے وہ نوجوان جو مغربی علوم سیکھنے کے بعد اپنے آپ کو روشن خیال اور آزاد طبع کہلانا پسند کرتے ہیں۔

اسلام کی گذشتہ تاریخ کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ خلفاء اور شاہان اسلام مادیات و روحانیت یعنی دنیا و دین دونوں کا مرکز سمجھے جاتے تھے۔ اور اسی لئے اسلام میں

قدرتاً" وہ اصول زندگی پیدا ہوگئے جو مذہب کا کاروبار دنیا اور ہنگامہ حیات کے دوش بدوش لے جانے کے ضامن تھے اور یہی سبب تھا کہ اسلام کے عہد وسطیٰ میں جو یقیناً" اس کا زرین دور تھا۔ ایک شخص کے لئے یہ متعین کرنا دشوار تھا کہ مسلمانوں کے اصول زندگی میں کس طرح خط فاصل کھینچ کر ان کے دین کو دنیا سے ممیز کیا جا سکتا ہے۔ کیونکہ ان کا بیٹھنا اٹھنا' کھانا پینا' جاگنا سونا' الغرض ان کا ہر ایک دنیاوی عمل مذہب ہی کے لئے تھا۔ جس طرح ان کے تمام مذہبی اعمال دنیاوی ترقی کی روح رواں تھے۔ یہی وہ چیز تھی جس نے حکمران جماعت اور علمائے دین کے گروہ کو ایک شیرازہ سے وابستہ کر رکھا تھا۔ اور اگر اتفاق سے کوئی مولوی یا عالم حکومت کے مصالح کے خلاف فتویٰ دینے کی جرات کرتا تھا تو اسے قید و بند میں ڈالا جاتا تھا۔ ممکن ہے اسے کوئی شخص حکومت کی زیادتی یا سلطنت کا ظلم قرار دے' لیکن جہاں تک اصول سیاست کا تعلق ہے۔ اس طرز عمل پر نکتہ چینی کی کوئی گنجائش نہیں پائی جاتی۔ اس طرح مسلمانوں کے عہد ترقی میں یہ جماعت کبھی آزاد و خود سر نہیں رکھی گئی اور ہمیشہ ان کو مجبور کیا گیا کہ وہ حکومت کے معاملے اور سیاست کی ضروریات کو سامنے رکھ کر اپنے احکام فقہی میں تبدیلی پیدا کرتے رہیں۔

ایک مولوی کے تمام تعلیمات ونصائح مذہبی کا موضوع صرف مابعد الطبعیات کی دنیا ہوتی ہے اور وہیں کے خوفناک تاریک مناظر سے ڈرا ڈرا کر وہ اپنی پرستش کرایا کرتا ہے۔ اس کو مطلق اس بحث نہیں کہ دنیا کہاں جا رہی ہے۔ زمانہ کس رفتار سے آگے بڑھ رہا ہے۔ جہل و تاریکی کس تیزی سے علم کی روشنی میں پیچھے ہٹ رہی ہے۔ وہ برابر یہی کہے جائے گا کہ جو کچھ میں کہتا ہوں اس کو برحق جانو' وہ اس سے بالکل ناآشنا ہے کہ اس وقت کے اقتصادی مسائل ہم سے کیا چاہتے ہیں اور پاکستان کی سیاسیات کا مستقبل کیا ہے۔ پھر لطف یہ کہ ایسے ہی جہل پر وہ فخر کرتا ہے۔ نادانی پر نازاں ہے اور کہتا ہے کہ اہل جنت تو ایسے ہی سیدھے سادے بھولے بھالے لوگ ہوتے ہیں درآنحالیکہ یہ جنت کی مخلوق جو ان معاملات میں اپنے آپ کو اس قدر نیک و بے خبر ظاہر کرنے پر فخر کرتی ہے کتنی ہوشیار و باخبر ہے۔ غریبوں کا روپیہ وصول کرنے میں اور جاہلوں کا گھر اجاڑ اجاڑ کر اپنا گھر بسانے میں جس وقت یہ کسی مجمع میں وعظ فرماتے ہوتے ہیں تو ان کی صورت و حالت یونان کے اس جیوپیٹر دیوتا کی سی ہوتی ہے۔ جس کے ایک ہاتھ میں دوزخ کے انگارے ہیں اور

دوسرے میں جنت کی گل فشانیاں اور وہ اپنے آپ کو بالکل مالک و مختار سمجھتے ہیں خواہ چشم زون میں جلا کر خاکستر کر دیں خواہ جنبش چشم وابرد ہر ہر ذرہ کو گل و گلزار بنا دیں۔ ان لوگوں کی اولین کوشش یہی ہوتی ہے کہ لوگوں کو دنیا و کسب دنیا کے خیال سے منحرف کر دیں اور اس لئے وہ غلط توجیہہ و تاویل کے ساتھ کلام مجید کی آیتیں بھی پڑھتے ہیں۔ احادیث نبوی سے بھی استناد کرتے ہیں' اقوال اعلیٰ کبار بھی سناتے ہیں اور مثنوی مولانا روم کے اشعار بھی خاص لحن کے ساتھ پڑتے ہیں اور اس تعلیم کا مقصود حقیقی سوا اس کے کچھ نہیں ہوتا کہ جب لوگ دولت کو حقیر سمجھنے لگیں گے تو نہایت آسانی سے ان کے حوالہ کر دیں گے۔ اسی کے ساتھ وہ دوسری نفسیاتی ضرب یہ لگاتے ہیں کہ قرون اولیٰ کے مسلمانوں اور عہد سلف کے اولیاء کرام کے واقعات سنا کر ان کے خوارق عادات اور کرامات کی داستانیں سنانے لگتے ہیں کہ انہوں نے کس طرح سینکڑوں سال کی غرق شدہ بارات کو زندہ نکال لیا۔ ایک شخص پر نگاہ ڈالتے ہی کیونکہ اس کے دل کا تمام حال بتا دیا۔ کسی کے بھاگے ہوئے غلام کو کس طرح ایک تعویذ لکھ کر واپس بلا دیا۔ اور پھر آخر میں وہ سارے وعظ کی تان "علماء امتی کا انبیاء بنی اسرائیل" پر توڑتا ہے اور احمق و جاہل مسلمانوں پر اپنی عظمت و بزرگی' اپنی غیر معمولی قوت روحانی اور اپنے محیرالعقول کارناموں کا سکہ بٹھا کر آخر کار ان کی جیبیں خالی کرالیتا ہے۔

پاکستان کا مولوی یا عالم دین جو بدقسمتی سے ہمارا قائد و رہنما اور مصلح بنا ہوا ہے۔ دوزخ و جنت کی روایات بیان کرنے میں رات دن لوگوں سے نمازیں پڑھوانے کی فکر میں تو بے شک منہمک نظر آتا ہے۔ لیکن وہ کبھی ایک لمحہ کے لئے بھی غور نہیں کرتا کہ جس قوم سے وہ اپنے لئے لذائذ دینوی حاصل کر رہا ہے۔ اس کی اقتصادی حالت کیا ہے اور اس کا انحطاط کس حد تک پہنچ چکا ہے۔

میں کہتا ہوں' بہ آواز بلند کہتا ہوں اور بلاخوف تردید کہتا ہوں کہ یہ وقت اس بات کے دیکھنے کا نہیں ہے کہ مسلمان نماز پڑھتا ہے یا نہیں روزے رکھتا ہے یا نہیں' دوزخ و جنت کا قائل ہے یا نہیں بلکہ صرف یہ سوچنے کا ہے کہ مسلمان کے پاس کچھ کھانے کو بھی ہے یا نہیں۔ اگر علماء دین ہمارے حقیقی بہی خواہ ہوتے اور ان کے دلوں میں ہمارا سچا درد ہوتا تو اس وقت تمام مواعظ مذہبی کو چھوڑ کر صرف اس پر غور کرتے کہ مسلمان اپنا پیٹ

کس طرح بھریں۔ ان کے بچے بھوک کی تکلیف سے کیونکر محفوظ رہیں۔ اور ان کی عورتیں کس تدبیر سے اسباب ستر پوشی حاصل کر سکیں۔ پھر میں پوچھتا ہوں کہ کیا ہمارے اس قائد و رہنما اور دینی و دنیاوی رہبر کو کبھی اس کا خیال آیا ہے کہ جس وقت وہ اپنے وسیع دسترخوان پر نفیس نفیس غذائیں کھانے میں معروف رہتا ہے۔ ٹھیک اسی وقت اس کے پڑوس میں کتنے مسلمان ایسے ہیں جو بھوک کے پیاسے پڑے ہوئے ہیں۔ اور کتنے بچے ایسے ہیں جن کی مائیں اپنی خشک چھاتیوں سے ایک قطرہ دودھ کا ان کے منہ میں نہیں ٹپکا سکتیں۔ جس وقت وہ حریر و کمخواب یا باریک چکن اور ولائتی تن زیب کی اچکن پہن کر ایک ادائے معشوقانہ کے ساتھ موٹر پر سوار ہونے کے لئے گھر سے باہر نکلتا ہے۔ کیا ایک لمحہ کے لئے بھی کبھی اس کا خیال اس حقیقت کی طرف منتقل ہوتا ہے کہ اس قوم کے کتنے افراد اس وقت جھلسا دینے والی دھوپ میں ننگے بدن' برہنہ پا پتھر توڑ رہے ہیں۔ کیا اس سے زیادہ دنیا میں کوئی بے عزتی' بے حیائی اور بے شرمی ہو سکتی ہے کہ جو افراد فاقہ کر کرکے' اپنے بچوں کا پیٹ کاٹ کاٹ کر اس کے لئے یہ نعائم و لذائذ فراہم کریں انہیں کے دکھ درد کی طرف سے وہ یوں بے خبر و بے پرواہ ہے۔ ہرچند فرعون و نمرود کو گذرے ہوئے زمانہ گذر گیا۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان کی اولاد اب تک دنیا میں باقی ہے اور اسی اخلاق سوز انسانیت شکن خصوصیات کے ساتھ جو کسی وقت ان کے اسلاف میں پائی جاتی تھیں۔ مگر یہ ہے کہ ان پر عذاب نازل ہو چکا ہے اور ان کے لئے ہنوز دست خدا میں انتظار کر رہا ہے۔

پاکستان کے عوام قوموں کے عروج و زوال کی تاریخ سے نابلد نہ ہوں گے۔ وہ اچھی طرح واقف ہوں گے کہ ایک مصلح یا پیغمبر کی مسجع و مقفےٰ گفتگو کو بھی اس کی زندگی کا بڑا کارنامہ نہیں سمجھا گیا۔ وہ جانتے ہوں گے کہ سکندر کی فتوحات پاؤں توڑ کر مقدونیہ سے بیٹھے رہنے سے حاصل نہیں ہوئی تھیں۔ وہ اس سے بخوبی آگاہ ہوں گے کہ اکاسرہ عجم کی قوت صرف وعظ و تلقین سے پارہ پارہ نہیں ہوئی۔ اس لئے وہ کون سی چیز ہے جو میدان عمل میں قدم اٹھانے سے انہیں بعض رکھتی ہے اور اس کانٹے کے چبھنے سے کیوں ان کے پاؤں میں کپکپی پیدا ہوتی ہے۔ جس کی خلش حاصل کئے بغیر منزل تک پہنچنا محال ہے۔ وہ کیوں اپنی قوت احتساب سے اس جماعت کو ختم کر دینے کا کام نہیں لیتے۔ جس کے

طویل جبہ و عمامہ میں قوم کی تباہیوں کے جراثیم اور اخلاق کی بربادیوں کے اسباب ہزار ہزار پنہاں ہیں اور وہ سب سے پہلے ان علمائے کرام اور مولیان عظام کو صفحہ زمین سے محو کرنے کی کوشش کیوں نہیں کرتے۔ جنھوں نے اپنے اعمال' رویہ اور افعال شنیعہ سے عالم اخلاق کو سوگوار اور دنیا سے نہفت و عمل کو حزیں و ملول بنا رکھا ہے۔ اگر وہ اب اس حد سے گذر گئے ہیں کہ اس کی اصلاح ہو سکے۔ اگر ان کی ذہنیت کی پستی اب کبھی اس بلندی کی طرف نہیں آسکتی جو کسی وقت اسلام کی خصوصیات خاصہ سمجھی جاتی تھی۔ اور اگر وہ ہماری جماعت کا ایک ایسا عضو ماؤف ہیں۔ جس کا قطع کر دینا ہی تنہا علاج ہے تو کیوں نہ اس جماعت کو منہدم کیا جائے اور بالکل جدید اصول سے از سرنو اسی درس کی یاد تازہ کی جائے جو ہر زمانہ' ہر قوم اور ہر ملک کے لئے یکساں مشعل راہ ہو سکتا ہے۔

آیئے اس سلسلے میں سب سے پہلے مذہب کے فلسفہ و ارتقاء پر غور کریں۔ پھر مذہب سے بغاوت کا مستقبل کیا ہے اور اگر کوئی مذہب زندہ رہ سکتا ہے تو کس طرح۔

نیاز فتحپوری

○ ○ ○

تاریخ مذہب

طبقات الارض و فلکیات کے ماہرین کا قول ہے دنیا کروڑوں برس کی عمر رکھتی ہے۔ یعنی اس کی موجودہ حالت کروڑوں برس کے تاریجی ارتقاء اور تغیر و تبدل کے بعد قائم ہوئی ہے۔ ہرچند یقین کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا ہے کہ انسان کا وجود روئے زمین پر کب سے پایا جاتا ہے۔ لیکن بعض ماہرین علم الاقوام کا خیال ہے کہ کم از کم پچاس لاکھ سال ہوئے جب اول اول انسان کا ظہور ہوا اور غالباً اسی وقت سے مذہب کا بھی وجود پایا جاتا ہے۔ ہرچند انسان نے اپنے خیالات و تجربات کو تحریر میں لانا صرف پانچ چھ ہزار سال سے شروع کیا ہے اور قدیم زمانہ کی جو روایات اس نے قلمبند کی ہیں وہ خرافیات کی حد سے آگے نہیں بڑھتیں۔ لیکن ان کی حالت دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اقوام و ملل کی رفتار میدان ارتقاء میں یکساں نہیں رہی اور ماحول کا اثر اس پر برابر پڑتا رہا ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بعض قومیں مدارج ارتقاء طے کر کے جلد معراج ترقی تک پہنچ گئیں اور بعض قومیں ابھی تک ظلمت و تاریکی کے دور میں زندگی بسر کر رہی ہیں۔ بہرحال ہمیں اقوام عالم کی صحیح تاریخ کا علم ہو یا نہ لیکن فطرت انسانی کو دیکھتے ہوئے یہ حکم آسانی سے لگایا جا سکتا ہے کہ مذہب انسان کی زندگی کے ساتھ پیدا ہوا۔ اور ہمیشہ اس کے ساتھ رہے گا۔ لیکن زمانہ و ماحول کے لحاظ سے جو اثر اس پر ہوتا ہے اس کے لحاظ سے اس میں تبدیلیاں بھی ہوئیں اور ہمیشہ ہوتی رہیں گی۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ انسان کا مذہب ابتدا میں کیا تھا اور رفتہ رفتہ کیا ہو گیا۔ اس مقصد کے لئے ہم اقوام عالم کی دو قسمیں کرتے ہیں ایک وہ مدارج جو ارتقاء طے کرتے کرتے متمدن و مہذب ہو گئیں۔ دوسری وہ جو ہنوز غیر متمدن اور وحشی ہیں۔

تخلیق مذہب

جب ذہن انسانی کا ابتدائی دور ختم ہوا اور اس میں سوچنے کی کیفیت پیدا ہوئی تو سب

سے پہلے اس کی توجہ اپنے جسم کے سایہ کی طرف منعطف ہوئی اور عدم پختگی عقل کی وجہ سے اس نے اس سایہ کو خود اپنا ہی ایک جزو یا زندہ "شئی" سمجھا۔ اسی کے ساتھ اس کے خیال میں یہ بھی آیا کہ جب وہ سوتا ہے تو شاید یہ روحیں ہیں جن سے سائیں سائیں کی آواز آتی ہے ساتھ ہی ساتھ ان روحوں کی صفلت کا خیال بھی دل میں پیدا ہوا اور موذی روحوں سے خوف و وحشت اور شفیق روحوں سے محبت کا اظہار کرنے لگا اور یہ تھی اولین بنیاد مذہب کی۔

پرستش

ابتدائے آفرینش میں انسان بحالت اشتراکیت رہا کرتا تھا اور دنیا کی کوئی چیز کسی مخص کی خاص ملکیت نہ سمجھی جاتی تھی۔ سب مل کر زندگی بسر کرتے تھے' لیکن ہمیشہ یہ حالت قائم نہیں رہی۔ ازبعد کو طاقتور نے کمزور کو دبانا شروع کیا اور "ادارہ" حقوق و ملکیت قائم ہو کر رفتہ رفتہ' سردار' راجہ و فرمانروا کا وجود عمل میں آیا' لیکن سرداری یا فرمانروائی صرف اسی دنیا تک محدود نہیں سمجھی گئی بلکہ اس کے مرجانے پر بھی وہی احترام قائم رہا اور اسے دیوتا سمجھنے لگے۔ یعنی اسی طرح دنیا میں زندہ بادشاہ کی فرمانبرداری اور مردہ بادشاہ کی پرستاری کا سلسلہ جاری ہوگیا۔ جسے عبادت و پرستش کی ابتدا کہنا چاہیے۔

بہشت و دوزخ

اس کے بعد انسان کے دل میں یہ سوال پیدا ہوا کہ مرنے کے بعد انسان کی روح کہاں جاتی ہے؟ پہلے تو یہ خیال ہوا کہ وہ تاریک جنگلوں میں یا نظروں سے دور کسی مقام میں رہتی ہے۔ لیکن جب جنگلوں میں چلنے پھرنے سے کبھی کسی روح سے ملاقات نہ ہوئی تو یہ خیال ہوا کہ وہ یا تو برف پوش پہاڑوں پر رہتی ہے' یا زمین کے نیچے کسی مقام پر چلی جاتی ہے اور یہیں سے سورگ و پاتال' بہشت و دوزخ' علیین و سجین وغیرہ کی روایات پیدا ہوئیں۔

مقتدایان دین

ارتقاء تمدن کے ساتھ ساتھ جب انسان نے خانہ بدوشی چھوڑ کر ایک جگہ اقامت اختیار کی اور زراعت و فلاحت میں مصروف ہوگیا تو اس نے اپنے مختلف اغراض و مشاغل

کے لحاظ سے مختلف دیوتا بنائے۔ انسان قدیم سمجھتا تھا کہ اس کی صحت و بیماری' زراعت و شکار اور تمام مقاصد کی کامیابی و ناکامی کا انحصار انہیں دیوتاؤں کی خوشنودی و برہمی پر ہے اور اسی لئے وہ پوجا پاٹ یا پرستش دنیا کو بہت اہمیت دینے لگا۔ کیونکہ وہ سمجھتا تھا کہ دیوتا بھی انسان کی طرح الحاح و زاری سے خوش ہوتے ہیں اور اگر خوشامد نہ کی جائے تو برہم ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ پرستش کے کے خاص مراسم قائم ہوئے اور جن لوگوں نے ان مراسم کے ادا کرنے میں مہارت حاصل کی۔ ان سے لوگ اپنی عبادت میں مشورہ لینے لگے۔ اور ان کی خدمت کے بدلے میں کچھ نذرانہ بھی دیا جانے لگا۔ اسی طرح پنڈتوں' پجاریوں' ملاؤں' دستوروں' موبدوں' بھکشوؤں اور پادریوں وغیرہ کی ابتدا ہوئی۔

مگر چونکہ درحقیقت اغراض و مقاصد میں کامیابی کا انحصار بھوتوں یا ارواح کی مدد پر نہیں ہے۔ اس لئے جب کبھی عبادت کرنے کے بعد بھی کسی شخص کا مقصد حاصل نہ ہوتا تھا تو وہ اپنے پجاری یا مقتدائے دین سے شکایت کرتا تھا اور وہ اپنا اعتبار و اعتماد قائم رکھنے کے لئے ادھر ادھر کی باتیں بنا کر ناکامی کی توجیہ کرنا شروع کر دیتا تھا۔ یہ تھی ابتدا اس جھوٹ کی جو سب سے پہلے ارباب مذہب کی طرف سے بولا گیا اور جس نے آگے چل کر تمام دنیا کو مکر و فریب میں مبتلا کر دیا۔

بت پرستی

ارتقاء تمدن کے ساتھ انسان کے خیالات میں بھی ترقی ہوئی۔ وہ دنیا کی چیزوں کو دیکھتا تھا۔ ان پر غور کرتا تھا۔ وہ سمجھنا چاہتا تھا کہ طوفان کیوں آتا ہے؟ دریا کیوں بہتا ہے؟ بادل کیوں گرجتا ہے' بارش کیوں ہوتی ہے؟ شیر و نہنگ اس قدر طاقتور و موذی کیوں ہیں؟ نباتات ہر سال از سرنو کیوں پیدا ہوتے ہیں؟ ان سوالات کا جواب اس کے ذہن کی طرف سے یہ ملتا تھا کہ یہ سب ارواح کے کرشمے ہیں۔ چنانچہ ہر بات کے لئے ایک بت قائم کر دیا گیا اور پوجا ہونے لگی۔

قاعدہ ہے کہ چھوٹی بات سے بڑی بات پیدا ہوتی ہے۔ جب چھوٹی چھوٹی ارواح کا خیال آیا تو اس کے بعد قدرت کی بڑی بڑی باتوں کا خیال آنا ضروری تھا۔ اس لئے سورج' چاند' ستارے' آسمان' زمین' بارش' بجلی' اور رعد وغیرہ کو بڑے بڑے دیوتاؤں سے منسوب کر کے ان کے ہیکل قائم کئے گئے اور اس طرح دنیا میں بت پرستی کی ابتدا ہوئی۔

توحید

جس طرح ایک قبیلہ دوسرے کو مغلوب کر کے طاقتور ہو جاتا تھا' اسی طرح بعد کو جب ایک بادشاہ نے دوسروں فرمانرواؤں کو مغلوب کر کے اپنا تابع بنالیا اور شہنشاہ ہوگیا تو انسان کا خیال دنیائے پرستش میں بھی انہیں اصول پر کاربند ہوا اور اس نے سمجھا کہ دیوتاؤں میں بھی کسی ایک دیوتا کو سب پر غالب آنا چاہئے اور اس طرح سب سے پہلے توحید کی بنیاد انسان کے دل میں پڑی۔

الحاد

لیکن انسان کے دماغ کو قرار نہیں۔ جوں جوں عقل میں پختگی آتی گئی خیالات میں بھی وسعت پیدا ہونے لگی۔ تمدن کی ترقی کے ساتھ ساتھ قصبوں اور شہروں کی بنیاد پڑی۔ کتابیں لکھی جانے لگیں۔ وسعت خیالات کے ساتھ عقائد پر مناظر شروع ہوگئے۔ جن امور کا منصروم بتوں یا دیوتاؤں کو سمجھا جاتا تھا ان کے اسباب و علل کچھ اور نکل آئے۔ کہیں گیس کا کرشمہ نظر آیا۔ کہیں برق و بخارا کا عمل اور اسی طرح تمام حوادث قدرت کی توجیہیں ہونے لگیں۔ یہ تھا پہلا صدمہ جو مذہب کو اب سے دو تین ہزار سال قبل پہنچا اور جسے دنیا الحاد سے تعبیر کرنے لگی۔

مذاہب الاخلاق

یہ حال ان مذاہب کا تھا جنہیں "مذاہب فطرہ" کہتے ہیں لیکن بالکل اسی طرح سے ابتداء و ارتقاء ان مذاہب کی بھی ہوئی ہے۔ جنہیں "مذاہب اخلاق" کہتے ہیں۔ اس میں کلام نہیں کہ مقتدایان مذہب اول اول اسی پر زور دیتے رہے کہ دیوتاؤں کی پوجا کرو' بھینٹ چڑھاؤ قربانیاں کرو۔ اور پجاریوں سے مدد لے کر ان کو نذر دو۔ جب رفتہ رفتہ ان میں تعلیم بڑھی تو انہوں نے انسان کی اعلیٰ زندگی پر بھی اقتدار قائم کر لیا اور معیشت و معاشرت کے آئین و قوانین بنا کر انہیں دیوتاؤں سے منسوب کیا۔ یہ تھی بنیاد مذاہب اخلاق کی۔

کتب مقدسہ

اول اول پوجا پاٹ کی رسمیں بطور اسرار سینہ بہ سینہ چلی آرہی تھیں' لیکن بعد کو

انسان نے حروف ایجاد کئے اور وہ لکھنے پڑھنے لگا تو مقتدایان دین نے ابتدائی اعتقادات اور قدیم رسموں کو مدون کرنا شروع کیا اور چونکہ حافظہ زیادہ کام نہیں دے سکتا تھا۔ اس لئے انہوں نے سنی سنائی باتوں سے ان کتابوں کو بھر دیا۔ لیکن اسی کے ساتھ اپنی قوم کی عظمت و شان بھی بیان کی۔ پرانے بادشاہوں اور قوموں کے کچھ قصے بھی داخل کئے اپنے معبود کو تمام معبودان عالم سے غالب قرار دیا اور اپنی قوم کو خیرالامم ظاہر کیا۔ انہوں نے یہ بھی ظاہر کیا کہ ان کا مذہب ابتدائے آفرینش سے اسی طرح چلا آتا ہے اور ہر جگہ اپنے خدا کی بزرگی اور جلال کا اظہار کیا۔

اب چونکہ احیاء علوم و فنون کو زمانہ ہے۔ تمام باتیں سائنس کی روشنی میں دیکھی جاتی ہیں۔ اس لئے ماہرین فن نے علم "معیارالمذاہب" اور "علم تقابل المذاہب" بھی ایجاد کیا۔ جس سے مختلف مذاہب کو بالمقابل رکھ کر جانچا جا سکتا ہے۔ علاوہ ازیں ماہرین آثار قدیمہ نے تمدن قدیم کے وہ تمام خزائن برآمد کر لئے جن کے ذریعہ سے کتب مقدسہ کے بیانات کی بخوبی جانچ کی جا سکتی ہے۔

قدیم مذاہب دراصل مظاہر قدرت کے متعلق جاہل اقوام و ملل کی سیدھی سادی خیال آرائی سے زیادہ کوئی چیز نہ تھے۔ لیکن جب بعد کو ان میں کچھ علمی تاویلیں اور اخلاقی اصول شامل ہو گئے تو مقتدایان دین یہ دعویٰ کر بیٹھے کہ ان کا مذہب الہامی ہے اور نتیجہ یہ ہوا کہ ہر مذہب دوسرے کا مضحکہ اڑانے لگا۔ کیونکہ مذہب کا صحیح علم طبقہ علماء تک محدود تھا اور عوام کو اس پر غور کرنے کی اجازت نہیں۔ تاہم تقابل مذاہب سے ہم کو یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ بعض مذاہب دوسروں کی نسبتاً اعلیٰ ہیں۔

○ ○ ○

مذاہب تاریخی

موجودہ تہذیب و تمدن کا آغاز اب سے پانچ ہزار سال پیشتر ہوا۔ لیکن اس کی ابتدا ایک جگہ نہیں بلکہ کئی جگہ ہوئی۔ سب سے پہلے تمدن کی ابتداء کریٹ' مصراور عراق میں ہوئی یہ تینوں ممالک قریب قریب واقع ہیں (اب سے پانچ ہزار سال قبل سرزمین کریٹ علیحدہ جزیرہ نہیں تھی بلکہ مغربی ایشیاء کا ایک حصہ تھی) الغرض ان تینوں ملک نے اپنا اپنا تمدن تقریباً ایک ہی ساتھ ساتھ شروع کیا اور رفتہ رفتہ اس قدر ترقی کی کہ وہ اپنے خیالات کا اظہار تصویروں کے ذریعہ سے کرنے لگے۔ جسے "خط صوری" کہتے ہیں۔

کریٹ

کریٹ (Crete) کا تمدن بھی اسی قدر اعلیٰ تھا جیسا مصر کا اور ہرچند ابھی تک وہاں کی قدیم زبان پر عبور حاصل نہیں ہوا۔ لیکن وہاں کے آثار قدیمہ سے یہ ضرور ثابت ہوتا ہے کہ وہاں کوئی' "مذکر دیوتا" نہیں تھا صرف ایک "دیوی" کی پرستش ہوتی تھی اور اس دیوی کی چھاتیاں بہت بڑی بڑی بتائی جاتی تھیں۔ جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ دیوی دراصل "دھرتی ماتا" تھی گویا اہل کریٹ کا مذہب اس دور سے آگے نہیں بڑھا تھا جب صرف مظاہر قدرت کی پرستش کی جاتی تھی۔

مصر

مصر قدیم کا مذہب بھی اہل کریٹ ہی کے مذہب سے ملتا جلتا ہے ہرچند دونوں کے معتقدات مذہب اور مذہبی رسوم میں بہت فرق پایا جاتا ہے یعنی اگر کریٹ میں صرف ایک "دیوی" تھی تو مصر میں دیوتاؤں اور دیویوں کی خاصی فوج موجود تھی' اور ان دیوتاؤں اور دیویوں کے پجاری بھی مختلف تھے۔ ان لوگوں میں حیات عقبیٰ کا وہی عقیدہ موجود تھا جو آج کل مسیحیت یا اسلام میں نظر آتا ہے۔ ان لوگوں کا عقیدہ یہ تھا کہ جب انسان مر

جاتا ہے تو اس کا "ہمزاد" حنوط شدہ لاش کے ساتھ قبر میں رہتا ہے اور اس کی روح جزا و سزا کے لئے خداوند اسیریز (Osiris) کے پاس چلی جاتی ہے۔ جو عالم ارواح کا بادشاہ ہے۔ اگر اس روح کی بداعمالیاں نیکیوں سے زیادہ ہوتی ہیں تو وہ روح تباہ یا فنا کر دی جاتی ہے۔ اگر روح کی نیکیاں اس کی بداعمالیوں سے زیادہ ہیں تو اسے "مسرت ابدی" کی نعمت بخش دی جاتی ہے۔

مصری مذہب کے متعلق سب سے زیادہ حیرت انگیز بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ اس میں جانوروں کا سر رکھنے والے دیوتاؤں کی بڑی تعداد موجود ہے حالانکہ جس قوم کا تمدن اس قدر اعلیٰ رہا ہو اس کو ایسے عجیب الخلقت خداؤں کے سامنے سر جھکانے سے احتراز کرنا چاہئے۔ لیکن مطالعہ مصریات سے معلوم ہوتا ہے کہ قدیم مصر کا صرفہ طبقہ جہلا ایسے دیوتاؤں کا معتقد تھا اور تعلیم یافتہ طبقہ ان دیوتاؤں کی پرستش نہیں کرتا تھا۔ پجاریوں کے مختلف طبقات نے اپنے اپنے مختلف دیوتا بنا لئے تھے۔ جن پر وہ آپس میں لڑتے رہتے تھے۔ علاوہ اس کے اس کا ایک سبب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ "وادی نیل" میں مختلف قومیں مختلف ممالک سے آکر آباد ہوئی تھیں۔ اولصر اس لیے ان دیوتاؤں کو مختلف ہونا چاہئے۔ کسی قوم کا دیوتا سورج تھا۔ کسی کا چاند' کسی کا عقاب' کسی کا گھڑیال' کسی کا بیل اور کسی کا بندر (بعض قدیم دیوی دیوتاؤں کے نام یہ ہیں ا۔ اوسیزیز (Osiris) مالک یوم الدین "سورج" ہورس (Horus) "نجات دہندہ" ا۔سیز (Icis) افزائش نسل و زراعت کی دیوی نت (Nit)' دولت خوشحالی کی دیوی آثور (Athor) گاؤ سر دیبی یا دھرتی ماتا' آنوبیس (Aanbis) سگ سر دیوتا' محافظ قبرستان) ان مختلف دیوتاؤں کے پجاری مدتوں تک خانہ جنگی میں مبتلا رہے اور آخر کار صدیوں کی لڑائی کے بعد مسیح سے چودہ سو برس قبل ان تمام اقوام کو ایک بادشاہ نے فتح کر کے انہیں پوری طرح منظم کیا اور ایک قوم بنا دیا۔ یہ بادشاہ امان حاطب رابع (IV AmenHateb) تھا۔ اس بادشاہ نے نہ صرف یہ کیا کہ مصریوں کو ایک قوم بنا دیا۔ بلکہ ملک میں ایک خالص روحانی مذہب بھی قائم کیا جو بڑی حد تک توحید کا درس دیتا تھا۔

بابل

اب سے تقریباً پانچ چھ ہزار قبل وادی فراتؔ کے مختلف علاقوں میں طوائف الملوکی قائم کی تھی۔ جگہ جگہ بہت سے آزاد شہر آباد تھے اور ہر شہر ایک خود مختار ریاست تھا۔

جن میں حکومت مقتدایاں دین کی تھی۔ اگرچہ بابل کی تاریخ بہت طویل ہے لیکن اس قدر بتا دینا کافی ہوگا کہ تمام ملک میں دو قومیں پورے اختلاط و ارتباط کے ساتھ بستی تھیں۔ ان میں ایک قوم سامری (Samerian) اور دوسری سامی یا سامیتقی (Semitici) تھی اور یہ دونوں قومیں شیر و شکر کی طرح ملی ہوئی تھیں۔ حتی کہ دونوں قوموں نے اپنے اپنے معبود بھی شامل کر لئے تھے۔ یہ لوگ کسی "حیوان پیکر" دیوتا کے پرستار نہین تھے۔ لیکن جب کامیاب پجاریوں نے اپنے دیوتاؤں کی عظمت و جلال کو فروغ دیا تو بہت سے چھوٹے چھوٹے دیوتا بن گئے۔ سامریوں کے دیوتاؤں میں بڑے بڑے دیوتا سنو و بعل (of Ball Sanu) خدائے آسمان یا دھرتی ماتا سن (Sin) چندر مان نوسکو (Nuska) اگنی وغیرہ تھے۔ اور سامیوں کے بڑے دیوتا اور دیویاں یہ تھیں۔ شمس (Shams) سورج مردوق (Marduk) سورج اشتار (Ishtar) عشق و محبت اور جنگ و جدال کی دیوی تموز (Thammuz) اور افزائش نسل و فصل کا دیوتا۔

جب یہ تمام ریاستیں مل کر سلطنت بابل قائم ہوئی۔ اس وقت بھی مقتدایان دین کی خصوصیت بدستور پائی جاتی تھی۔ لیکن نہ اس قدر اور آخر کار وہاں کا مقامی خدا مردوق سب سے بڑا خدا بن بیٹھا۔ جس کے بعد شمس کا دور دورہ ہوا۔

الغرض ارتقاء تمدن کے ساتھ تہذیب معتقدات کا سلسلہ بھی جاری ہوا اور دیوتاؤں کی شخصیت میں زیادہ تجرید اور روحانیت پیدا ہوتی گئی۔ حتی کہ اشتار جو پہلے فسق و فجور کی دیوی تھی اور جس کے بھون میں "مقدس حرام کاری" ہوا کرتی تھی وہی درماندگی اور معصیت کی جائے پناہ اور زاہدان مرتاض کی سرپرست بن گئی۔

چین

یہ امر باور کرنے کے وجوہ موجود ہیں کہ ملک چین کی قدیم تہذیب و تمدن کا ابتدائی سرچشمہ مغربی ایشیا تھا۔ اسی لئے قدیم چین کا تمدن' بابل کے تمدن سے ملتا جاتا تھا۔ ہرچند چینیوں کا دعویٰ ہے کہ ان کا تمدن کم از کم بیس ہزار سال کا ہے لیکن محققین کا خیال ہے کہ اس کی عمر پانچ چھ ہزار سال سے زیادہ کی نہیں ہے۔

قدیم چین کے مذہب کا حال ان مغلی قبائل کے معتقدات و رسوم سے معلوم ہو سکتا ہے جو حدود چین کے اندر یا ان سے متصل آباد تھے۔ یہ قومیں کچھی' یو قانصر' قرباق اور

انیو تھیں۔ پچکیوں کے نزدیک درخت' جنگل' جھیل' دریا وغیرہ ہر چیز کا ایک دیوتا تھا۔ جسے ان کی اصطلاح میں آقا یا مالک کہتے تھے۔ مرجانے والوں کی روحیں سعید ہوں یا خبیث زندہ سمجھی جاتی تھیں۔ خبیث ارواح کے متعلق یہ عقیدہ تھا کہ دیہات و ریگستان میں رہتی ہیں اور لوگوں کو ستاتی ہیں۔ انہیں وہ لوگ شیاطین کہتے تھے اور یہ ارواح خبیثہ لوگوں کو بہت ستاتی تھیں۔ اس لئے جھاڑ پھونک کرنے والوں کی بھی کثیر تعداد موجود تھی جنہیں وہ لوگ "شمن" کہتے تھے۔

ان میں ایک بڑا دیوتا بھی تھا۔ جسے وہ اپنی زبان میں جان بخش و آفریدگا' کہتے تھے لیکن تعجب یہ ہے کہ وہ اس کی عبادت نہیں کرتے تھے۔ ہندوؤں میں بھی "آفر۔ننندہ" دیوتا برہما ہے لیکن اس کی پرستش نہیں ہوتی' یوقاغیروں اور قریاقوں میں بھی ایک آسمانی خدا تھا اور ان لوگوں کا یہ عقیدہ تھا کہ اگر اس کے حضور میں جانوروں کی قربانی دینے میں کوتاہی کی جاتی ہے تو ناراض ہو کر سو جاتا ہے اور پھر دنیا میں "فساد" پیدا ہو جاتا ہے الغرض یہ ابتدائی حالت چین کے معتقدات کی تھی۔

قدیم چینیوں کے مذہب میں عام دیوتاؤں کا سردار ایک "مہادیو" تھا جسے وہ لوگ "شنگتی" (اعلیٰ آسمانی بادشاہ) یا "تین" (آسمان) کہتے تھے جو سب سے بلند مرتبہ کا معبود خیال کیا جاتا تھا۔ الغرض یہاں مسیح کی پیدائش سے تین ہزار سال قبل ایک "آسمانی خدا" کا عقیدہ ضرور تھا" اگرچہ طبقہ عوام و جہلا میں چھوٹے چھوٹے دیوتاؤں کی پرستش ہوتی تھی۔

چھٹی صدی قبل مسیح میں دولت چین پر ادبار و زوال کی گھٹائیں چھائیں اور ہر جگہ عالم فساد برپا ہو گیا۔ اس وقت ملک میں دو شخص ایسے پیدا ہوئے جنہوں نے ملک کو ظلمت و جہالت سے نکالنا چاہا ایک کا نام لاوٹسا تھا اور دوسرے کا نام کنگفو یا کنفوسش (Congfutse) یہ دونوں "لاادریت" (Agnosticism) کے قائل تھے اور ان کے اثر سے تعلیم یافتہ چین اب اڑھائی سال پیشتر درجہ "لا ادریت" کو پہنچ گیا تھا۔ لاؤٹشا نے جسے فارسی زبان میں "لوشا" کہتے ہیں۔ مذہب "تاؤمیت" (Taaism) قائم کیا (لفظ تاؤ کے معنی چینی زبان میں صراط مستقیم کے ہیں) لیکن بعد میں یہ مذہب "بودیت" (Budhism) سے مل کر مجموعہ اوہام ہو گیا۔

حکیم کنفوشس کی تعلیم بھی لا ادریت پر مبنی ہے اور اس کا خلاصہ یہ ہے کہ انسان کا فرض ہے کہ روحانی ہستیوں کا احترام کرتے ہوئے ان فرائض کو صحیح طور پر ادا کرے۔ جو اس پر از روئے حقوق العابد عائد ہوتے ہیں روحانیت کے درپے ہونا مناسب نہیں یہ مذہب صرف مجموعہ ضوابط اخلاق ہے۔ جس پر اڑھائی ہزار برس سے چین کا روشن خیال طبقہ حامل ہے۔

جاپان

جاپان کا تمدن و شائستگی میں چین کا اس قدر حصہ شامل ہے کہ جاپان کو اس سے علیحدہ سمجھنا فضول ہے۔ جاپان میں عوام کا مذہب سنتوئیت (Shintoism) ہے جو چین کے مذہب تاؤئیت کا مترادف ہے۔ علاوہ ازیں چین کی طرح جاپان میں بھی بودیت کے مراسم داخل مذہب ہیں۔ لوگ کہتے ہیں کہ مذہب شنتو میں اسی لاکھ دیوتا ہیں۔ بودیت کی طرح مذہب کنفوشا بھی جاپان میں چین سے آیا۔ اور قرنہاقرن سے تعلیم یافتہ جاپانی اسی مذہب کے اصول پر عامل ہیں۔

○ ○ ○

مذاہب الہند

مشہور ہے کہ براعظم ہند میں جتنی زبانیں بولی جاتی ہیں وہاں اتنے ہی مذہب بھی رائج ہیں۔ ایک طرف کوہستان نیل گری کے نیم وحشی توڑے ہیں جو ارواح یا دیوتا کے معتقد ہیں۔ دوسرے طرف آریا ہیں جو خود کو خدا پرست کہتے ہیں ایک طرف وشنوئی ہیں جو رام اور کرشن اور وشنو کے اتاروں کو مانتے ہیں دوسرے طرف شیومت والے ہیں جو "لنگ اور یونی" یا مہا دیو اور پاربتی" کی پرستش میں اپنی فلاح و نجات سمجھتے ہیں۔ سنسکرت کی قدیم ادبیات اور مغربی ایشیاء کے اثار قدیمہ سے ثابت ہوتا ہے کہ ہندوستان کی آریا قوم کا تعلق قدیم اقوام فرنگ سے عموماً اور ایرانیوں سے خصوصاً بہت زیادہ تھا اب سے تین ہزار تین سو برس قبل جب اہل میدیا (Media) کو اپنی پڑوسی مغربی سلطنت سے شکست حاصل ہوئی تو ایک صلح نامہ لکھا گیا۔ جسے ماہرین آثار قدیمہ نے برآمد کر لیا ہے۔ اس معاہدہ کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اہل میدیا نے ایسے دیوتاؤں کو ضامن قرار دے کر دستخط کئے ہیں جو قدیم آریوں کے دیوتا تھے۔ مثلاً اندر' درن اگنی وغیرہ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اہل میدیا اور قدیم آریا قوم کا وہی مذہب رہا ہوگا جو قدیم ایرانیوں کا تھا۔

آریا قوم یا قدیم ہندوؤں کے مذہب کا حال "ویدوں" سے معلوم ہوتا ہے لیکن ویدوں میں جو حالات اس قوم کے بتائے گئے ہیں ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ قوم دماغی لحاظ سے بہت ترقی یافتہ تھی۔ بہرحال محققین اور مستشرقین کی کاوش سے یہ بات ثابت ہوگئی ہے کہ قدیم ایرانیوں رومیوں سلافیوں توتانیوں (یعنی جرمن) کلٹوں (Celts) اور آریاؤں کے مذاہب باہم گر بہت متشابہ تھے۔

آریوں کی آمد سے قبل ہندوستان میں اور قومیں بھی آباد تھیں جنہیں آج کل کے علماء "دراڈری" اقوام (Dravidians) کہتے ہیں۔ یہ لوگ جب زرخیز میدانوں سے

نکال دیئے گئے تو وہ دور افتادہ کوہستانوں اور وادیوں میں جانب جنوب آباد ہو گئے۔ ان لوگوں کا مذہب اب بھی صرف مظاہر قدرت کے دیوتاؤں کی پرستش ہے۔ مشرقی ہند کی کھاسی قوم (Khasie) کا بھی یہی مذہب ہے اور یہی حال زمانہ قدیم میں تمام ممالک و اقوام کا تھا یعنی وہ معبودان فطرۃ (Nature gods) کے پرستار تھے۔

آریا قوم اپنے ساتھ دوسرے دیوتا بھی لائی جو صفات میں قدیم دیوتاؤں سے افضل تھے یہ دیوتا تین اقسام پر مشتمل ہیں۔

آسمانی دیوتاؤں میں سب سے زیادہ اہم سوریہ یا سورج نرائن (یہی بابلیوں اور سامیوں کا شمسائیل تھا اشاس دیوی (صبح) یہ سوریہ کی ماں ہے (فضائی دیوتاؤں میں سب سے بڑے اندر (بارش) رعد بجلی وغیرہ کا دیوتا۔ اسی کو عبرانیوں اور اسلامیوں کا میکائیل سمجھنا چاہیے۔ اور وردن (ہوا کا دیوتا) ہیں۔ ارضی دیوتا میں سب سے بڑے اگنی (آگ کا دیوتا) اور پرتھوی (دھرتی ماتا) ہیں۔ اگر شمار کیا جائے تو قدیم ہندوں کے ۳۳ کروڑ دیوتا تھے۔ لیکن جب تمدن کے ساتھ دماغ میں پختگی آئی اور خیالات میں رفعت پیدا ہوئی تو چند خاص دیوتاؤں کو چھانٹ کر انہیں درجہ الوہیت اور روحانیت دے دیا گیا۔ (قدیم یونانیوں میں جو دیوتا زیوس (Zeus) تھا وہی رومیوں میں جیوپیٹر (Jupitar) کہلایا اور قدیم ہندوؤں میں دیوس پتر (Dayuspitra) چینوں میں یہی دیوتا شگنی تھا جو غالباً سنسکرت کے لفظ شکتی کی چینی صورت ہے۔ شکتی "طاقت" ہندا شکتی علت العلل ہوا)

مسیح سے تقریباً آٹھ سو برس پیشتر برہمنوں نے جنہیں کھانے کمانے کی کوئی فکر نہ ہونے کے باعث بے حد فرصت تھی مظاہر قدرت پر تخیل آرائی کرنی شروع کر دی اور ایک فلسفہ مذہب بنام "ویدانیت" ایجاد کیا جس میں روح و مادہ اور اسباب و علل سے بحث کی گئی ہے لیکن چونکہ ہندو الہیات جمہور کی رسائی فہم سے بہت دور ہے اس لیے عام ہندوؤں کا مذہب ابھی تک وہی بت پرستی چلا آتا ہے۔ جسے فلسفہ ویدانت سے کوئی تعلق نہیں۔ زمانہ حال کے ہندوؤں میں ایک اور جماعت پیدا ہوئی ہے جو خود کو "آریہ" کہتی ہے۔ ان کی تعلیمات میں وحدانیت کی جھلک بڑی حد تک نمودار ہے۔

مسیح سے چھ یا سات صدی قبل ہندو مذہب سے بودھ مذہب اور جین مت پیدا ہوئے جن کے بانی گوتم بدھ اور مہابیر تھے ان مصلحین نے فلسفہ الہیات کو بالائے طاق

رکھ کر لوگوں کو صرف تزکیۂ نفس اور حقوق العباد ادا کرنے کی تلقین کی۔ تمام کائنات کا مدار ان کے نزدیک کرم یعنی اعمال پر ہے۔ یہ لوگ دیوتاؤں اور خدا کی ہستی کے منکر ہیں۔ یہ گویا الحاد ہوا جو توحید کے بعد پیدا ہوتا ہے۔

○ ○ ○

مذاہب امریکہ

محققین آثار نے یہ بات ثابت کر دی ہے کہ کولمبس کی آمد سے قبل جو لوگ امریکہ میں آباد تھے وہ الاسکا ایشیا کے شمال و مشرق سے آئے تھے۔ یہ واقعہ غالباً اب سے پانچ چھ ہزار برس قبل کا ہے لہٰذا ظاہر ہے کہ ان لوگوں کے مذہبی عقائد تقریباً وہی ہوں گے جو ایشیا کی مغول اقوام کے تھے۔

قطب شمالی کی قوم اسکیمو (Eskimo) کا عقیدہ ہے کہ دنیا کی ارواح رفتگان سے (جن میں زیادہ تر خبیث روحیں ہیں) معمور ہے۔ اور چونکہ یہ ارواح خبیثہ ہمیشہ انسان کے درپے آزار رہتی ہیں۔ لہٰذا ضروری ہے کہ ان سے محفوظ رہنے کے لئے جھاڑنے پھونکنے والوں کی خدمات حاصل کی جائیں اور ان کو نذرانے دیئے جائیں۔ ان لوگوں میں نہ کوئی دیوتا ہے نہ کوئی معبود اور اس لئے ان کے یہاں پوجا پاٹ یا عبادت نہیں ہے۔ جنوبی امریکہ کے قدیم قبائل میں یہی معتقدات ہیں۔ اگرچہ ان کے خیالات مذہبی کسی قدر بلند ہو گئے ہیں۔

شمالی امریکہ کے قبائل یقین رکھتے ہیں کہ ارواح رفتگان قائم رہتی ہیں۔ یعنی جب انسان مرجاتا ہے تو اس کی روح جانب مغرب زیر زمین کسی مقام میں چلی جاتی ہے' (یہی ہندوؤں کا "پاتال" ہے) مگر اس کے ساتھ ان کا عقیدہ یہ بھی ہے کہ ہر روح کا ایک "سایہ" ہوتا ہے جو بعد از مرگ دنیا میں رہ کر لوگوں کو ستاتا ہے۔ ان کے یہاں مختلف مظاہر قدرت کے متعلق مختلف دیوتا موجود ہیں۔ ہر دیوتا کے پجاری علیحدہ ہوتے ہیں۔ جن کا دعویٰ یہ ہے کہ وہ دیوتا حسب الطلب۔ "ان کے سر آتے ہیں" ہندوؤں کی چھوٹی چھوٹی جاہل قوموں کا بھی یہی عقیدہ ہے۔ ان کے علاوہ بڑے بڑے دیوتا الگ ہیں۔ سب سے بڑا دیوتا "زندگی کا دیوتا" یعنی آفریدگار ہے۔ جس کی جائے قیام آفتاب ہے۔ یہ وہی دیوتا ہے جو ہندوؤں میں "سورج ناوائن" کہلاتا ہے' ایک دیبی (دیوی) "آسمان کی لافانی

بڑھیا" ہے جو چاند میں رہتی ہے۔ چنانچہ یہاں بھی عوام میں مشہور ہے کہ چاند میں بڑھیا بیٹھی چرخہ کات رہی ہے۔ اول الذکر دیوتا کی ایک عجیب کرامت بتائی جاتی ہے اور وہ یہ کہ جب یہ دیوتا اپنے سرین کھجاتا ہے تو زمین پر بارش ہوتی ہے۔

جوں جوں زمانہ گذرتا گیا ان میں بعض قومیں زیادہ متمدن اور شائستہ ہوتی گئیں اور اسی نسبت سے ان کے معتقدات مذہبی میں بھی بلندی پیدا ہوئی۔ ان اقوام متمدن میں ایک قوم مایا (Maya) تھی۔ اس قوم میں قدیم آدیوں کی طرح ہوا کا دیوتا (ہندوں کا درن) بارش کا دیوتا (آریوں کا اندر) افزائش نسل و فضل کی دیوی (گوراپارپتی۔ برتھوی) موت کا دیوتا آریوں کا۔ سورج) وغیرہ موجود تھے۔ ان دیوتاؤں کے پجاری نہایت دولت مند اور ان کے مندر نہایت عالیشان تھے۔ مندر کا متولی نسلاً بعد نسل چلا آتا تھا۔ مایا قوم میں دو زبردست قومی ہیرو ایسے گذرے تھے۔ جنہیں دیوتا بنا دیا گیا تھا' ان میں ایک کا نام "کوکل کان" (Kukalkan) تھا (ممکن ہے "کوکل کان دراصل "گوکل کانہ یا کاتھا رہا ہو جو سری کرشن جی کی عرفیت ہے) اس قوم میں انسانی قربانی کا رواج تھا جسے کوکل کان نے منع کر دیا تھا۔ شہر چیچن اتزہ (Chichin) میں ایک مقدس تالاب تھا۔ جس میں قربانی کے انسانوں کا خون ڈالا جاتا تھا۔ قومی ضرورت کے وقت سینکڑوں جوان اور کنواری لڑکیاں دیوتا پر قربان کر دی جاتی تھیں۔

پیرو (Peru) میں بھی یہی تمدن تھا اور وہاں کے ترقی یافتہ لوگ بھی شرک اور بت پرستی میں مبتلا تھے۔ ان چھوٹے دیوتاؤں کے ساتھ بڑے بڑے دیوتا بھی ان کے یہاں موجود تھے۔ ان دیوتاؤں کے بت ٹھوس سونے کے بنائے جاتے تھے۔ جن کو نہایت عالیشان اور خوبصورت مندروں میں رکھا جاتا تھا۔ اس کے علاوہ وہی پرانے دیوتا۔ بارش' بادل اور بجلی وغیرہ کے بھی پائے جاتے تھے۔ آخری زمانہ میں سورج کا درجہ سب دیوتاؤں پر غالب ہو گیا تھا۔ جس کی خدمت کے لئے مندر میں حسین و جمیل لڑکیاں رکھی جاتی تھیں (جنوبی ہند کے مندروں میں بھی ایسی داسیاں موجود رہتی تھیں)۔

امریکہ کی دوسری قدیم قوموں میں ایک قوم تولتیق (Toltece) تھی جو میکسیکو میں پھیلی ہوئی تھی۔ تمام ملک میں اس قوم کے عالیشان آثار قدیمہ پھیلے ہوئے ہیں۔ اس قوم کا صنم اکبر قوتیز الکوتل (Quetezalcootle) تھا۔ جس کے معنی "پردار سانپ"

کے ہیں۔ یہ دیوتا اس قوم کا "افریدگار" تھا۔ لیکن روایات سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ دراصل "چندرمان دیوتا" تھا۔ پھر وہ ہوا کا دیوتا بن گیا۔ ایک روایت یہ بھی ہے کہ اس کا نام ایک بادشاہ تھا۔ جس نے انسانی قربانی کی رسم بند کردی تھی۔

ایک روایت میں لکھا ہے کہ اس صنم اکبر کی ایک بیوی بھی تھی جسے وہ لوگ اپنی زبان میں تیزکالتی پوقا (Tezcaltipoca) اندھیرے پکش کا چاند کہتے تھے۔ یہ اخلاقیات کی دیوی تھی اور گنہگاروں کے اعمال کی جانچ اور جزا و سزا کا کام اسی کے سپرد تھا۔

امریکہ کی ایک اور متمدن قوم ازتیق (Azteec) تھی۔ اس قوم کا صنم اکبر سورج تھا۔ جس پر وہ انسان کی بھینٹ چڑھاتے تھے انسانی قربانی کا اس قدر رواج کسی دوسری قوم میں نہ تھا۔ ان کے قدیم دیوتاؤں میں چندرمان دیوتا' ستارہ صبح کی دیوی (جسے یونانیوں میں وینس (Venus) رومیوں میں جیونو (Juno) آشوریوں میں اشتارتہ (Ishtarte) عربوں میں زہرہ اور ایرانیوں میں ناہید کہتے ہیں)

افزائش نسل و فضل کی دیوی (مصریوں کے یہاں آثور (Athor) کے نام سے یونانیوں کے یہاں آفرودیتہ (Aphrodite) کے لقب سے اور ہندوؤں کے یہاں پاربتی و پرتھوی کے نام سے موسوم تھی) اور وتزیلو چتلی (Vitzilopochitli) جنگ کا دیوتا تھا۔

الغرض اول اول ان میں سورج' چاند' ہوا' بارش' آگ اور رعد وغیرہ سب کے دیوتا موجود تھے۔ اور بعد کو یہ سب دیوتا ملا کر صرف ایک دیوتا بنالیا گیا اور اسی کو جزا و سزا کے اختیارات دے دیئے گئے۔

O O O

مذاہب عجم

جس طرح کوئی بڑا دریا اپنے سرچشمہ سے نکل کر وادی کے خشک علاقوں کو سیراب کرتا چلا جاتا ہے اور اس میں بیسیوں ندی نالے آکر مل جاتے ہیں۔ اسی طرح مذہب بھی مختلف زمانوں میں مختلف مدارج ارتقاء طے کرتا چلا جاتا ہے اور اس میں ادھر ادھر کے مختلف خیالات و معتقدات داخل ہوتے جاتے ہیں۔ عبرانیوں کا مذہب جسے سب سے پہلا آسمانی یا الہامی دین بتایا جاتا ہے۔ مذاہب بابل' مصر و ایران اور یونان کا رہین منت ہے اور انجیل میں تو ایران کے مذہب کا بہت بڑا حصہ پایا جاتا ہے۔

ایشیائے کوچک کے اس علاقے سے جہاں قدیم زمانہ میں آریہ قوم کی ہندی ایرانی شاخ آباد تھی۔ اہل ایران نقل و حرکت کرکے ان کوہستانوں میں جابسے جو شمال میں واقع ہیں۔ تقریباً ایک ہزار سال تک یہ لوگ بحالت گمنامی و خانہ بدوشی پھرتے رہے۔ اس وقت ان کا مذہب وہی تھا جو قدیم ہندوؤں کا تھا۔ رفتہ رفتہ بابل و آشوریہ کے شاندار تمدن وجود میں آئے جنہوں نے وادی فرات و دجلہ کو رشک جنت بنا دیا۔ ان کی شان و شوکت اور جلال و عظمت دیکھ کر دنیا کی آنکھیں خیرہ ہوگئیں۔ جب روز روز کی جنگ وجدال سے دونوں تمدن خاک میں مل گئے اور بابل ونینوا کی اینٹ سے اینٹ بج گئی تو دنیا کی حکومت ایرانیوں کے ہاتھ آئی۔

ان قدیم ایرانیوں کی مقدس کتب زند اور اوستا کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان میں بھی حسب معمول بے شمار روحوں کا عقیدہ پایا جاتا ہے۔ ہر ملک' صوبہ' شہر' گاؤں' دریا اور درخت وغیرہ کا ایک دیوتا تھا اور روحوں کے بقا کے قائل تھے۔ ان کے یہاں سعید اور خبیث دو قسم کی روحیں تھیں۔ ان سب پر ایک آسمانی خدا تھا جس کا نام مترا (Mitra) ہے اور اسی کے ساتھ ہندو مذہب کے دوسرے دیوتا بھی پائے جاتے تھے' مگر بعد ایرانی اور ہندو مذہب میں کچھ اختلاف ہوگیا۔ ہندوؤں کا "دیوتا" ایران میں شیطان

بن گیا اور جو ہستی ہندوؤں میں "آسر" کہلاتی تھی وہی ایران کا "اہور" بن گئی۔ علاوہ ازیں ماحول اور آب وہوا کے اثر دیگر اختلافات بھی پیدا ہوگئے، لیکن "اگنی پوجن" (آگ کی پوجا) دونوں میں بدستور قائم رہی۔

چھٹی یا ساتویں صدی قبل مسیح میں ایران کے اندر ایک جدید مصلح یا پیغمبر کا ظہور ہوا۔ جس کا نام "زرتشترا" (زرتشت یا زردشت) ہے۔ اس پیغمبر نے مذہب ایران کی صورت بدل دی اور اس میں زیادہ پاکیزگی اور روحانیت پیدا ہوگئی۔ زرتشت نے چھوٹے چھوٹے دیوتا سب غائب کر دیئے صرف دو طاقتیں باقی رہ گئیں۔ آہورامزدا (خدائے خیر) اور اہرمن (خدائے شر) یا بالفاظ دیگر یزدان و شیطان۔ اس مذہب میں مصریوں کی طرح یہ عقیدہ موجود تھا کہ انسان کی روح بعد موت باقی رہتی ہے اور اعمال نیک وزشت کی جزا وسزا ملتی ہے۔ لیکن زرتشت نے اس عقیدہ کو اور زیادہ تقویت دی یعنی نیکوکاری اور پاکدامنی پر بہت زیادہ زور دیا۔ اس مذہب کا یہ عقیدہ ہے کہ قوت خیر کے علاوہ ایک زبردست قوت شر بھی ہے۔ اور اس کے ساتھ بے شمار "اخوان الشیاطین" موجود ہیں۔ آہورامزدا یعنی قوت خیر نے ڈھیل ڈال رکھی ہے۔ لیکن وہ بالاخر ان تمام شیاطین کا استیصال کر دے گی۔ اس وقت آسمانی سلطنت کا دور دورہ ہوگا۔ پہلے دنیا آگ سے تباہ کر دی جائے گی اور تمام شیاطین ہلاک ہو جائیں گے تو نیکوکاروں کو مسرت ابدی کا انعام ملے گا۔ جن لوگوں کے اعمال زشت ہیں۔ انہیں میعادی سزائیں ملیں گی، لیکن جب وہ گناہوں سے پاک ہو جائیں گے تو بہشت میں داخل کر دیئے جائیں گے اور بالاخر بہشت رہ جائے گی۔

کچھ عرصہ کے بعد اس مذہب کے عقائد سے انحلال پیدا ہوا اور بابلی تمدن کا اثر رنگ لایا یعنی پرانا خدا مترا (Mitra) جو قدیم زمانہ میں ایک موہوم آسمانی دیوتا تھا۔ اب آہورمزدا کے بجائے تخت جلال پر آبیٹھا اور مستقل طور پر سورج نارائن ہوگیا۔

ایران سے یہ مذہب "مترائیت" رومی دنیا میں پہنچا جو ابتدا مسیحیت کے وقت تک روم میں موجود تھا۔ چنانچہ ہر سال ۲۵ دسمبر کو مترا دیوتا کا جشن میلاد منایا جاتا تھا۔ جس کی ولادت ایک پوشیدہ غار میں ہوئی تھی (یہی زمانہ "سورج نارائن" کی "پیدائش" یعنی آغاز عروج کا ہوتا ہے اور دن بڑا ہونے لگتا ہے)۔ مترا کے بھگتوں کو خون سے بتسمہ دیا جاتا تھا

اور سخت ریاضتیں کیا کرتے تھے۔

فلسطین

ارض فلسطین ایک چھوٹا سا ملک ہے جس کا محل وقوع اس طرح واقع ہے کہ اس کے چاروں طرف بڑی بڑی سلطنتیں واقع تھیں۔ یعنی مشرق میں بابل' جنوب مغرب میں مصر' شمال میں سلطنت حطیوں (Hittites) سواحل پر فنیقیہ (Phonecia) ان تمام سلطنتوں کی فوجیں اور سوداگروں کے قافلے فلسطین سے گذرتے تھے جن کا سلسلہ ہزاروں برس تک جاری رہا۔ آخر میں آکر ایرانیوں' یونانیوں اور رومیوں نے بھی اس تک کو روند ڈالا۔

یہ امر باور کرنے کے لئے کافی وجوہ ہیں کہ جس پر اسرار قوم کو قدیم عبرانی فلسطینی (Philistiney) کہا کرتے تھے۔ وہ دراصل جزیرہ کریٹ سے ہجرت کر کے آئی تھی اور اپنے ساتھ سلیمان سے بھی پہلے کا قدیم تمدن لائی تھی۔

مسیح سے تقریباً تیرہ سو برس پہلے جب عبرانی قوم عراق سے ہجرت کر کے صحرا و بیابان کو عبور کرتی ہوئی حدود شام میں پہنچی تھی۔ اس وقت وہ بمشکل متمدن ومہذب کہی جا سکتی تھی۔ ان کا قومی معبود جیہوا (Jehova) تھا۔ یہ آسمانی خدا غالباً اسی قسم کا تھا جس طرح دیگر اقوام ملل میں آسمان و سورج و رعد کے دیوتا ہوا کرتے تھے۔ اگر عہد نامہ عتیق کے ابتدائی صحف کا مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہو گا کہ ان کے مضامین میں معیار اخلاق سے اس قدر گرے ہوئے ہیں کہ ان کا اور اخلاق مصر' بابل و ایران کا کوئی مقابلہ نہیں ہو سکتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اول اول یہ ایک خانہ بدوش پہاڑی قوم تھی۔ جس کا مشغلہ صرف مویشی پالنا تھا۔ اس کے بعد جب گردو نواح کے تمدن کا اثر پڑا تو ان کے خیالات میں وسعت و بلندی پیدا ہو گئی اور جب ساتویں اور چھٹی صدی قبل مسیح میں زیادہ روشن خیال انبیاء بنی اسرائیل پیدا ہوئے تو معیار اخلاق اور بلند ہو گیا جیسے کہ ان کے صحف سے ثابت ہوتا ہے۔ پانچویں صدی میں جب بنی اسرائیل گرفتار ہوئے تو وہاں کی باتیں بھی انہوں نے سیکھیں۔

اس کے بعد مسیح و ارتقاء مسیحیت کا زمانہ آیا اور عبرانیوں کا فطری مذہب کسی قدر ترمیم وتہذیب کے بعد دنیا کا اخلاقی مذہب بن گیا۔

○ ○ ○

یوروپ

اقوام فن (فن لینڈ کے باشندے) مجار (Majyar) باشندگان ہنگری اور ترک کے علاوہ جتنی ایشیائی قومیں ہیں وہ اور یوروپ کی تمام اقوام دطل قوم آریا کی نسل ہیں۔ جو ایرانیوں اور ہندوؤں کی مورث اعلی تھی۔ ایک شاخ اس قوم کی جانب مغرب پہنچی اور سواحل بحیرہ بالٹک پر مسلط ہوگئی۔ یہ تیوتانی (Teutonic) کہلائی۔ دوسری شاخ جانب جنوب گئی اور یونان اطالیہ پر قبضہ جمالیا۔ تیسری شاخ وسطی ممالک میں رہی اور اب سلافی (Slavo) کہلاتی ہے۔ یہی وجہ ہے یورپ کی تمام قدیم اقوام کا مذہب تقریباً ایک ہی تھا۔ یونانیوں کا سب سے بڑا آسمانی دیوتا زیوس (Zeus) تھا جو روم میں جیوپتر (Jupitar) کہلاتا اور ہندوؤں میں اسی کو دیوپتر کہنے لگے۔ دراصل ان تمام ناموں کا مادہ لفظ (Deva) ہے۔ یونانیوں اور رومیوں کی "دھرتی ماتا" اس آسمانی باپ کی بیوی تھی۔ دونوں قوموں میں جنگ کا دیوتا موجود ہے جو یونان میں "ایریس" اور روموں میں (Mars) کہلاتا۔ آگ کا دیوتا یونانیوں میں ہفتاستوس (Hephostos) تھا اور رومیوں میں ولکن (Velcan) اور یہی قدیم ہندوؤں کا اگنی تھا۔ پانی کے دیوتا کا نام یونانی زبان میں پوسی آئڈن (Poseidon) اور رومی زبان میں نپچون (Nepeune) ہے۔ یونانیوں میں عشق و محبت کی دیوی آفرودیتہ (Aphrodite) ہے اور رومیوں میں وینس (Venus) کہلاتی ہے۔ یہی بابلیوں کی اشتار' عربوں کی زہرہ اور ایرانیوں کی ناہید ہے۔

ناروے' سویڈن' جرمنی اور انگلستان کے قدیم باشندے بھی یہی مذہب رکھتے تھے۔ ہفتہ کے دنوں کے ناموں پر غور فرمایئے۔ خودبخود معلوم ہو جائے گا' مثلاً سنڈے (Sunday) آفتاب کا دن۔ ٹیوزدے (Tuesday) (Mercurys day) وڈنسڈے (Marsday Wednesday) دوڈن اور مارس دونوں جنگ کے دیوتا

ہیں۔ اسی طرح جیوپٹر کو تھورس (Thorus) کہا جاتا ہے۔ جس سے تھرسڈے (Thursday) بنا۔ وینس کو فریجا کہتے تھے۔ اس سے فریجاسڈے یا (Friday) بنا اسی طرح سٹرڈے دراصل سیٹرن (Saturn) زحل سے بنا۔

ان ناموں سے آپ معلوم ہوگیا ہوگا کہ قدیم اقوام یوروپ کا مذہب دراصل مظاہر فطرت ان کا مذہب (Nature Religion) تھا اور اس کے علاوہ درختوں' دریاؤں' جنگلوں' کنوؤں وغیرہ کے بھی دیوتا پوجے جاتے تھے۔ (ہندوؤں میں اسی قسم کے سینکڑوں دیویاں اور دیوتا موجود ہیں)۔ الغرض عہد تاریخ میں قدم رکھنے سے پہلے تمام یوروپ کا وہی قدرتی مذہب تھا جو دیگر اقوام عالم کا تھا اور دیوتاؤں اور دیویوں میں بعض بزرگان قوم بھی شامل کر دیئے جاتے تھے۔ (جیسے ہندوؤں میں رام اور کرشن موجود ہیں)۔ یونانیوں کے آسمانی دیوتا کوہ اولمپس (Olympus) پر رہتے تھے اور وہیں ان کی بہشت تھی۔ اسی طرح ایرانیوں کی بہشت بھی کوہ البرز پر تھی۔ اور ہندوؤں کے دیوتا کیلاش اور میرد پربت پر رہتے تھے۔

جوں جوں زمانہ گذرتا گیا۔ یونانیوں کے خیالات میں بھی وسعت پیدا ہوتی گئی۔ رفتہ رفتہ حکماء کے ذہن سے تمام مختلف دیوتا محو ہوگئے اور وہ آخر میں توحید پرست ہوگئے۔ چنانچہ سقراط' افلاطون اور ارسطو کا یہی مذہب تھا' لیکن حکیم زینو (Zeno) اور ابیقورس (Epicurus) ملحد تھے۔ وہ کسی خدا یا دیوتا کو نہیں مانتے تھے۔

مسیح سے تقریباً ایک ہزار سال قبل یونانیوں نے یوروپ کے قدیم قبائل کا دیوتا "دیونی سوس" (Dionysos) بھی اپنے دیوتاؤں میں شامل کر لیا یہ دراصل شراب اور فسق وفجور کا دیوتا تھا۔ یہ ہر سال مرتا اور دوبارہ زندہ ہوتا تھا۔ ان کے تہوار خاص اہتمام سے منائے جاتے تھے۔ سوانگ اور تماشے ہوتے تھے۔ جلوس نکالے جاتے تھے۔ لیکن دراصل ان تہواروں سے مقصد اس حقیقت کو یاد دلانا تھی کہ سال میں ایک بار زمین کی قوت نمو مرجاتی ہے جسے خزاں سمجھنا چاہئے اور پھر پیدا ہو جاتی ہے۔ جو موسم بہار ہے۔ مصر' شام اور بابل میں بھی اسی کے تہوار منائے جاتے تھے۔ جن میں دیوتا مرکر زندہ ہوتا تھا۔

الغرض جملہ مذاہب قدیمہ پر سرسری نظر ڈالنے سے یہ باتیں معلوم ہوتی ہیں کہ

(ا) عہد وحشت میں انسان کا اعتقاد یہ تھا کہ اس کا ایک سایہ ہمزاد ضرور ہے اور مرنے کے بعد روح اسی دنیا میں رہتی ہے۔

(۲) روحیں سعید وخبیث دو قسم کی مانی جاتی ہیں جو انسان کو فائدہ یا نقصان پہنچا سکتی ہیں۔

(۳) قدرت کی ہر چیز میں روحوں یا دیوتاؤں کا خیال پیدا ہوا اور سینکڑوں دیوتا بن گئے۔

(۴) متعدد دیوتاؤں میں سے چند کو بلند مرتبہ دے کر مذہب میں روحانیت پیدا کی گئی۔

(۵) متعدد دیوتاؤں کو باہم ملا کر ایک بڑا دیوتا بنایا گیا اور اس طرح توحید کی طرف میلان ہوا۔

(۶) توحید پرستی کے اندر ہی غور وخوض کرتے ہوئے روحانیت والہیات سے لاادریت پیدا ہوئی اور احکام مذہب احکام اخلاق وحسن معاشرت بن گئے۔

(۷) روحانیت غائب ہونے کے بعد ذات واجب الوجود کا اعتقاد متزلزل ہوا اور الحاد کی بنیاد پڑی جیسا کہ فرانس اور امریکہ میں آج کل نظر آرہا ہے۔

○ ○ ○

مسیحیت

قدیم موسوی یا یہودی مذہب میں چند ترمیمیں کرنے کے بعد عیسائی مذہب بنایا گیا۔ اس کی تعلیم اخلاقی ہے ہر بات میں تزکیہ نفس بلکہ نفس کشی کی ہدایت پائی جاتی ہے۔ اس مذہب کے بانی مسیح خیال کئے جاتے ہیں۔ اناجیل اربع جن میں مسیح کی سوانح عمری اور ان کی تعلیم ہے وفات مسیح کے بہت دنوں کے بعد ان کے حوار ئین نے لکھی تھی۔ مسیح کی نسبت یہ عقیدہ ہے کہ

(۱) وہ اپنی والدہ مریم کے بطن سے بغیر باپ کے پیدا ہوئے اور مریم کنواری تھیں۔ اس لئے مسیح ابن اللہ ہیں۔

(۲) یسوع نے جب اقتضاء وقت شریعت موسوی میں ترمیم و تنسیخ کی اور ایک جدید اصلاح شدہ مذہب اخلاق جاری کیا۔

(۳) علماء یہود نے یسوع پر بغاوت کا الزام لگایا اور رومی حاکم کے فرمان سے وہ مصلوب کرکے دفن کر دیئے گئے۔

(۴) تین دن بعد وہ اپنی قبر سے زندہ ہو کر باہر نکلے۔ اور اپنے شاگردوں سے مل کر انہیں آخری ہدایات کیں اور پھر آسمان پر اپنے باپ خدا کے پاس چلے گئے۔

(۵) آدم نے خدا کے حکم کی نافرمانی کر کے تمام بنی نوع انسان کو گنہگار بنایا۔ مسیح نے مصلوب ہو کر انسان کے گناہوں کا کفارہ کر دیا۔

(۶) قیامت کے قریب مسیح دوبارہ دنیا میں آئیں گے۔

(۷) مسیح مامور من اللہ تھے اور ان کا مذہب الہامی ہے۔

مذاہب عالم کی تاریخ میں سب سے زیادہ عجیب وغریب اور پرلطف واقعہ، جو اس وقت بھی بعض زندہ مذاہب سے عقائد وتعلیمات کا ایک جزو ضروری سمجھا جاتا ہے۔ مسیح نا صری کا وجود کا ہے۔ ان کا واقعہ پیدائش سے لے کر صلیب پر چڑھائے جانے تک بلکہ

اس کے بعد بھی ان کے آسمان پر اٹھالئے جانے اور پھر دوبارہ روئے زمین پر نزول اجلال فرمانے تک جو کچھ بیان کیا جاتا ہے۔ وہ اس قدر دلچسپ ہے کہ بسا اوقات اس کی اہمیت مشتبہ معلوم ہونے لگتی ہے اور ذہن مجبور ہو جاتا ہے کہ اس کی "رومانیت" سے علیحدہ ہو کر بھی کبھی غور کرے کہ جو کچھ مسیح کے متعلق مذہبی کتابوں میں بیان کیا جاتا ہے۔ اس میں واقعی کوئی اصلیت ہے یا صرف "دیو وپری" کی سی کہانیاں ہیں جو غلطی سے داخل مذہب ہو گئی ہیں؟

اس مسئلہ پر گفتگو کے دو طریقے ہیں۔ ایک تو یہ کہ ہم اپنے آپ کو عیسوی مذہب یا کسی اور ایسے مذہب کا سچا معتقد سمجھ کر جو اس واقعہ کی صحت کا موید ہے۔ پہلے ہی سے یہ یقین کر لیں کہ جو کچھ ان مذاہب کی کتابون میں بیان کیا گیا ہے۔ وہ حقیقت ہے اور بغیر کسی تاویل وحجت یا تبصرہ وتنقید کے مان لینے کے قابل۔ اور دوسرا طریقہ یہ ہے کہ مذہب ومذہبیت سے بالکل خالی الذہن ہو کر تاریخی وعلمی تحقیق کو ذریعہ یقین بنائیں۔ اس میں شک نہیں کہ اول الذکر صورت ضمیر انسانی کے لئے بہت محفوظ ومعصوم کیفیت رکھتی ہے۔ لیکن جس حد تک علم وتحقیق کی جستجو متعلق ہے۔ اس کی کمزوری کسی سے مخفی نہیں اور وہ ایک لمحہ کے لئے بھی اس ذہن کو مطمئن نہیں کر سکتی جس کو خود سمجھ کر کسی بات کے ماننے کا چسکا پڑ گیا ہے۔

چونکہ یسوع ناصری کی حیات ووفات کے متعلق جو حالات دنیا کو معلوم ہوئے ہیں وہ اناجیل اربعہ یا صحائف (عہد نامہ جدید) کے ذریعہ سے معلوم ہوئے ہیں۔ اس لئے سب سے پہلے ہم کو یہ دیکھنا چاہئے کہ خود اناجیل اربعہ کی کیا اہمیت ہے اور ان پر کس حد تک اعتبار کیا جا سکتا ہے۔

آپ کسی بڑے سے بڑے ماہر انجیل یا عیسائی سے دریافت کیجئے کہ انجیلوں کا مصنف کون تھا وہ کوئی یقینی جواب نہ دے سکے گا۔ کیونکہ حقیقتاً آج تک نہیں معلوم ہو سکا کہ انجیلوں کا اصل لکھنے والا کون ہے۔ کیونکہ ہر انجیل کے عنوان پر "بقول متی" یا "حسب بیان متی" درج ہے اور "مصنف متی" کہیں نہیں لکھا گیا۔ بعض کا خیال ہے کہ تیسری انجیل واقعی لوقا کی ذاتی تحقیق کا نتیجہ تھی۔ لیکن خود لوقا کا بیان یہ ہے کہ "میں ان بیانات کا عینی شاہد نہیں ہوں۔ بلکہ جس طرح مجھ سے قبل اور بہت سے آدمیوں نے یسوع کے

حالات قلمبند کئے ہیں۔ اسی طرح میں بھی کہتا ہوں۔"

انجیلیں چار ہیں۔ مرقس' متی' لوقاء' یوحنا۔ ان میں سے سب سے پرانی مرقس کی مانی جاتی ہے۔ جو مسیح کے تقریباً ستر سال بعد لکھی گئی' اس کے بعد متی اور لوقا کی انجیلیں ہیں جو ۹۰ سال بعد مرتب کی گئیں اور پھر یوحنا کی انجیل ہے جو دوسری صدی کی پیداوار ہے۔ اچھا اب آیئے ان روایات پر پہلے ایک تنقیدی نگاہ ڈال لیں۔ جو مسیح کے باب میں ان انجیلوں کے اندر پائی جاتی ہیں۔

کنواری کے پیٹ سے پیدا ہونا اور مر کر دوبارہ زندہ ہونا یہی دو خاص واقعے مسیح کے متعلق ایسے ہیں جو معجزہ کی صورت سے بیان کئے جاتے ہیں۔ لیکن ان دونوں باتوں کی جو شہادتیں اناجیل میں پائی جاتی ہیں ان میں باہم سخت اختلاف ہے۔ انجیل مرقس کی نسبت خیال کیا جاتا ہے کہ یہ سب سے "پرانی انجیل ہے اور اس میں سب سے زیادہ صاف حال بیان کیا گیا ہے۔" شاید یہ سن کر حیرت ہوگی کہ یہی انجیل تحریفات کا دفتر بے پایاں ہے۔ اس انجیل کا قدیم ترین نسخہ وہ ہے جو باب ۱۶ آیت ۸ پر ختم ہو جاتا ہے اور آخری باب کا باقی حصہ کسی اور شخص نے بعد میں اضافہ کیا ہے۔ کیونکہ اس حصہ کا طرز تحریر نہ صرف یہ کہ ابتدائی حصہ سے بالکل علیحدہ ہے بلکہ اس کی تردید بھی کرتا ہے۔ مثلاً ساتویں آیت میں ایک فرشتہ عورتوں سے کہتا ہے کہ "تم جاؤ اپنا راستہ لو۔ اس کے شاگردوں اور پطرس سے کہہ دو کہ وہ تم سے پہلے شہر جلیل کو جائے گا اور تم اسے وہیں دیکھو گے جیسا کہ اس نے تم سے کہا تھا۔" قدیم مصنف انجیل کا بیان ہے کہ یہ بات ان تینوں عورتوں میں سے کسی نے نہیں کہی۔ کیونکہ وہ ڈرتی تھیں۔ لیکن جدید مصنف کا بیان ہے کہ ایک عورت کو یسوع کا دیدار ہوا اور اس نے یسوع کے شاگردوں سے یہ ماجرا بیان کیا۔ لیکن کسی نے یقین نہیں کیا۔ چنانچہ اس کے بعد یسوع نے کسی دوسرے پیکر میں اپنے شاگردوں سے گفتگو کی مگر کسی کو یقین نہ آیا حالانکہ بقول مرقس' یسوع نے ان لوگوں سے اپنے دوبارہ جی اٹھنے کی پیشین گوئی کر دی تھی۔

افسوس ہے کہ انجیل مرقس کا ابتدائی حصہ بھی قابل اعتبار نہیں۔ اسی حصہ میں بیان کیا گیا ہے کہ "تین عورتیں اتوار کے دن علی الصباح گئیں تاکہ خداوند) کے جسم پر خوشبودار مسالے ملیں۔" لیکن مصنف مذکور کو اس بات کا خیال نہیں رہا کہ ملک یہودیہ

(Judea) جو ایک نہایت گرم ملک ہے اور جہاں لاش دن کے دن سڑ جاتی ہے۔ اپریل کے مہینہ میں مرنے سے دو روز بعد لاش پر خوشبودار مسالہ ملنے کا خیال کسی شخص کے دل میں بھی نہیں آسکتا تھا۔ علاوہ ازیں ان عورتوں کی نسبت یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ وہ یہ بات جانتی تھیں کہ یسوع کی قبر کے منہ پر ایک بھاری پتھر رکھا ہوا ہے۔ جسے وہ ہٹا نہیں سکتیں، باوجود اس علم کے بھی وہ کسی مرد کو اپنے ساتھ نہیں لی جاتیں۔ اور وہ حیران ہو کر یہ سوچتی ہیں کہ غار کے دہانہ سے پتھر کی سل کیونکر ہٹائیں گے۔ پھر ان عورتوں کو قبر کے اندر ایک نوجوان مرد بیٹھا نظر آتا ہے۔ باوجود ان تمام واقعات اور حوادث کے وہ یہودی عورتیں خاموش رہتی ہیں۔ حالانکہ ان کو حکم دیا گیا تھا کہ وہ جاکر تمام ماجرا لوگوں سے بیان کریں۔ مگر وہ گھر جاکر پھر بھی کسی سے یہ حال نہیں کہتیں۔ حتیٰ کہ یہاں تک بھی بیان نہیں کرتیں کہ خداوند کی لاش غائب ہوگئی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ انجیل مرقس میں جو کچھ بیان کیا گیا ہے وہ تحریف و تضاد کا ایک دفتر بے پایاں ہے۔ چند باتیں اسی سلسلے میں اور بھی قابل غور ہیں۔ یعنی

(۱) یوسف (اریماثیاہ) نے دفن کرنے کے لئے لاش کو پوری طرح تیار کر لیا تھا (ملاحظہ ہو باب ۱۵ آیت ۴۶)

(۲) صلیب کی حفاظت کے لئے جو رومی سپاہیوں کا دستہ تعینات تھا۔ اس کے افسر سے بھی یسوع کی شان میں یہ کہلایا گیا کہ:۔ "یقیناً یہ شخص خدا کا بیٹا تھا۔"

(۳) یسوع کے رشتہ دار اور شاگرد عرصہ دراز تک اس کی کراماتیں اور معجزے دیکھ چکے تھے۔ وہ یہ بھی جانتے تھے کہ یسوع خدا ہے جس نے جسد خاکی قبول کر لیا ہے اور ان کا یہ بھی ایمان تھا کہ اس نے بنی نوع انسان کے گناہ کا کفارہ بن کر صلیب پر اپنی جان دی مگر بایں ہمہ وہ لوگ خوش ہونے کے بجائے خوفزدہ تھے اور پھوٹ پھوٹ کر روتے تھے۔

متی کی انجیل

بلحاظ قدامت انجیل مرقس کے بعد انجیل متی کا نمبر آتا ہے۔ لیکن اس شخص نے وفات اور احیاء ثانیہ کے متعلق جو کچھ لکھا ہے اس سے بیان مرقس کی تردید ہوتی ہے۔ مثلاً قبر یسوع کی نسبت بیان کیا گیا ہے کہ یہودیوں نے قبر کو بند کر کے اس پر پہرہ لگا دیا تھا۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ یہودی علماء کو خیال تھا کہ چونکہ یسوع اپنے احیاء ثانیہ کی

نسبت پیشین گوئی کر گیا ہے۔ اس لئے ممکن ہے کہ اس کے شاگردوں میں سے کوئی شخص یسوع کی لاش کو قبر سے باہر نکال لے جائے اور پھر یہ اعلان کر دے کہ وہ مر کر جی اٹھا۔ اس کے بعد متی نے ایک شدید زلزلہ کا ذکر کیا ہے۔ جس کا حال کسی تاریخ میں درج نہیں ہے۔ لیکن جب قبر یسوع کا پتھر ہٹانے کے لئے زلزلہ سے بھی کام نہ چلا تو متی نے ایک فرشتہ پیدا کیا۔ جس نے پتھر کو کندھا دیا اور پھر اسے اس پتھر پر بٹھا دیا۔ (مرقس نے فرشتہ کو قبر کے اندر بٹھلایا تھا)۔ اس فرشتہ خداوندی کا جلال دیکھ کر رومی سپاہیوں کا دستہ لرزہ براندام ہو جاتا ہے۔ (انجیل مرقس میں عورتوں نے فرشتہ کے بجائے "ایک اجنبی نوجوان مرد" دیکھا تھا جس کے حکم کی وہ تعمیل تک نہیں کرتیں)۔

متی کی انجیل میں دو عورتیں (مرقس کی انجیل میں عورتوں کی تعداد تین ہے)۔ خوفزدہ ہو کر دم بخود ہونے کے بجائے فوراً خوش خوش دوڑ جاتی ہیں تا..کہ شاگردان یسوع سے تمام حال بیان کریں۔ اسی واقعہ پر ایک حاشیہ یہ بھی چڑھایا گیا کہ یسوع ان کو یروشلم جاتا ہوا ملا۔ (مرقس میں یسوع کی صورت ایک عورت کو عرصہ بعد نظر آئی تھی)۔ پھر رومی سپاہیوں کی نسبت یہ بیان کیا جاتا ہے کہ وہ جاتے ہیں اور بڑے بڑے مقتدایان یہود سے تمام ماجرا بیان کرتے ہیں۔ بعد ازاں وہ مقتدایان دین سپاہیوں کو رشوت دے کر یہ کہلا دیتے ہیں کہ وہ سب کے سب پہرہ پر سو گئے تھے۔ لیکن یہ عجیب ماجرا ہے کہ باب ۱۷ آیت ۶۵ میں بیان کیا گیا ہے کہ رومی گورنر پلاطس نے فوجی سپاہیوں کے دستہ کو دینے سے انکار کر دیا تھا۔ اور مقتدان دین یہود کو ہدایت کی تھی کہ وہ اپنی پولس کے آدمی تعینات کریں۔ اور انہوں نے ایسا ہی کیا تھا۔ مگر مگر باب ۱۸ آیتہ ۱۴ میں وہی پولس کے آدمی رومی سپاہی بن جاتے ہیں جو صرف گورنر کے سامنے جوابدہ ہیں۔ (حالانکہ گورنر صاف کہہ چکا تھا کہ وہ اس معاملہ سے کوئی تعلق نہیں رکھتا)۔ اور پھر یہی رومی سپاہی چند روپے رشوت لے کر سزائے موت قبول کرنے پر تیار ہو جاتے ہیں۔ کیونکہ رومی فوج میں پہرہ پر سو جانے کی سزا قتل تھی۔

متی کی انجیل میں یسوع کے شاگردوں سے کہا جاتا ہے کہ اگر وہ مر کر زندہ ہو جانے والے خداوند سے ملنا چاہتے ہیں تو جلیل کے پہاڑ پر کسی مقررہ اور پوشیدہ جگہ پر جا ملیں۔ اور اگرچہ ان شاگردوں کو یسوع کے احیاء ثانیہ کا ذرہ برابر بھی یقین نہیں۔ مگر وہ پھر بھی

جاتے ہیں اور اپنے خداوند سے ملتے ہیں۔ یہ ہے حال انجیل متی کے خرافیات کا۔

لوقا کی انجیل

اس کے بعد لوقا طبیب کی انجیل پر توجہ فرمایئے یہ شخص پہلے تو یہ بیان کرتا ہے کہ اریماشیاہ کے یوسف نے یسوع کی لاش کی تکفین کر کے اسے دفن کر دیا۔ لیکن بعد میں وہ عورتوں کو (جن کے ساتھ بعض اور آدمی بھی شامل ہو جاتے ہیں)۔ مرہم اور خوشبودار مسالہ دے کر قبر یسوع پر بھیجتا ہے۔ ان عورتوں کو (جیسا کہ متی نے بیان کیا) قبر پر بیٹھا ہوا کوئی درخشاں صورت فرشتہ دکھائی نہیں دیتا۔ (جو بقول متی قبر سے باہر پتھر پر بیٹھا ہوا رومی سپاہیوں کے خوف زدہ دستہ پر مسکرا رہا تھا)۔ اور نہ انہیں کوئی "اجنبی نوجوان" قبر کے اندر بیٹھا ہوا نظر آیا۔ (جیسا کہ مرقس کا بیان ہے)۔ بلکہ دو آدمی زرق لباس پہنے نمودار ہوتے ہیں اور ان عورتوں سے تمام ماجرا بیان کرتے ہیں۔ یہ عورتیں اپنے گھروں کی طرف دوڑ جاتی ہیں۔ اور یسوع کے شاگردوں کو یاد دلاتی ہیں کہ یسوع نے واقعی یہ پیشن گوئی کی تھی کہ وہ مر کر پھر زندہ ہو جائے گا۔ لیکن یسوع کے شاگرد یہ ماجرا سن کر بھی اسے "بچوں کی کہانی" کہتے ہیں اور خیال کرتے ہیں کہ یسوع ہرگز ایسا نہیں تھا جو مر کر دوبارہ زندہ ہو جاتا۔

اس کے بعد ایک نیا بیان مرتب کیا جاتا ہے کہ ایک مسیحی جماعت جو پولوس کے خلاف پطرس کے پیرو ہے وہ پطرس کو قبر یسوع کی طرف لے جاتی ہے۔ حالانکہ یہی پطرس ہے جس نے عورتوں کے بیان کو "بچوں کی کہانی" سمجھ کر ٹال دیا تھا۔ الغرض قبر یسوع پر پہنچتا ہے اور وہاں اسے یسوع کا کفن ملتا ہے۔ اس وقت پطرس تنہا تھا۔

لیکن کلیسائے مسیحی میں جو جماعت یوحنا کی پیرو ہے وہ یہ بات نہیں مانتی۔ انجیل یوحنا میں (باب ۲۰ آیتہ ۴) پطرس اور یوحنا کی پہاڑی پر دوڑ ہوتی ہے۔ جس میں پطرس ہار جاتا ہے۔ علاوہ ازیں انجیل یوحنا میں کفن کے متعلق تفصیلات بھی زیادہ نظر آتی ہیں۔ اناجیل کے بیانات میں یہ عجیب خصوصیت ہے کہ وفات یسوع سے جس قدر بعد کسی مصنف کو ہو جاتا ہے۔ اسی قدر اس کا علم واقعات کے متعلق دیگر مصنفین سے زیادہ ہو جاتا ہے پولوس کو بہت کم حالات معلوم ہیں۔ مرقس بمقابلہ پولوس کے زیادہ حالات جانتا ہے۔ متی اور لوقا (جو صدی کے آخر میں ہوئے ہیں)۔ وہ اور بھی زیادہ حالات سے واقف ہیں۔ لیکن

یوحنا جو سب سے بعد (یعنی دوسری صدی عیسوی میں آتا ہے)۔ وہ ہر بات سے واقف ہے۔

بہرحال لوقا کے نزدیک یسوع (جس میں اب کوئی عنصر خاکی نہیں رہا)۔ اپنے دو شاگردوں کے ساتھ چند میل تک چلا جاتا ہے اور وہ بھی اس قدر طبعی طور پر کہ ان شاگردوں کو لمحہ بھر کے لئے بھی اس کے وجود میں کوئی شک وشبہ نہیں ہوتا۔ حالانکہ یسوع طویل گفتگو کے بعد اپ پر ثابت کرتا ہے کہ اس کا مرنا اور جی اٹھنا لازمی تھا۔ گویا یسوع نے ان کے ساتھ کئی گھنٹے تک خاک چھانی۔ بہرحال وہ شاگرد بڑے جوش میں گھر پہنچتے ہیں اور جان لیتے ہیں کہ جس شخص سے اثناء راہ میں ان کی ملاقات ہوئی تھی۔ وہ خدا تھا پھر وہ یہ حال دوسرے لوگوں سے بیان کرتے ہیں۔

واضح ہو کہ پہلی انجیلوں میں یسوع اپنے شاگردوں سے یروشلم میں ملاقات کرنے سے انکار کر دیتا ہے۔ اور جلیل کی پہاڑی پر کوئی جگہ ملاقات کے لئے مقرر کرتا ہے۔ لیکن اب ان کے سامنے شہر یروشلم میں نمودار ہو جاتا ہے۔ اور باوجودیکہ اس کے شاگرد اس کے ہاتھوں اور پاؤں پر صلیب کی میخوں کے نشانات دیکھتے ہیں۔ مگر پھر بھی وہ اس کی ہستی پر شبہ کرتے ہیں۔ اور صرف اس بات سے اپنا اطمینان کرتے ہیں کہ وہ شہد اور مچھلی کھاتا ہے یا نہیں۔ اس انجیل میں ایک اور بات پہلی انجیلوں کے خلاف یہ ہے یسوع اپنے شاگردوں کو یروشلم چھوڑنے سے منع کرتا ہے۔ لیکن وہ لوگ دلیری کے ساتھ ہیکل کی طرف دوڑ جاتے ہیں اور گلا پھاڑ پھاڑ کر تمام ماجرا لوگوں سے بیان کرتے ہیں۔

انجیل یوحنا

اب اس کے بعد ہمارے خیال میں انجیل یوحنا پر زیادہ غور کرنے کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ کیونکہ دس بیس برس بعد انہیں قصوں میں اور چار چاند لگ جاتے ہیں۔ انجیل یوحنا میں ہم پڑھتے ہیں کہ نیکودیمس اور یوسف نے واقعی یسوع کی لاش پر بمقدار کثیر مسالے ملے تھے۔ کیونکہ انجیل یوحنا باب ۱۹ آیتہ ۳۹، ۴۰ میں لکھا ہے کہ وہ لاش پر ملنے کے لے سوا من مر اور عود لائے تھے۔ اس سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ مریم میگدیلینی کوئی مسالہ نہیں لے گئی تھی۔ وہ تنہا اور خالی ہاتھ گئی تھی۔ علاوہ ازیں اسے نہ کوئی فرشتہ نظر پڑا نہ کوئی پولس والا دکھائی دیا۔ وہ گھر کی طرف دوڑ جاتی ہے اور پطرس

(غالباً یوحنا) سے بھی بیان کرتی ہے جو قبر کی طرف دوڑتے ہیں۔ لیکن وہاں ان کو بھی کوئی فرشتہ نظر نہیں آتا۔ بہرحال مریم میگد یلینی تنہا جاتی ہے اور دو فرشتے دیکھتی ہے۔ وہ روتی اور فریاد کرتی ہے کہ یسوع کی لاش کو کوئی شخص چرا لے گیا۔

اس سے آگے جو آیتہ آتی ہے اس میں یسوع مریم میگد یلینی کو بھی دکھائی دیتا ہے۔ وہ یہ سمجھتی ہے کہ شاید یہ کوئی باغبان ہے اور اسی نے یسوع کی لاش چرائی ہے۔ پھر یسوع مریم میگد یلینی سے باتیں کرتا ہے، لیکن اپنے جسم کو ہاتھ لگانے نہیں دیتا۔ بعدازاں وہ عورت یہ تمام حال یسوع کے شاگردوں سے بیان کرتی ہے۔ یوحنا اور مرقس برخلاف لوقا اور متی کے اس بات پر ہم خیال ہو جاتے ہیں کہ یسوع یروشلم میں اپنے شاگردوں کو ضرور نظر پڑا۔ گویا جلیل کے پہاڑ والا واقعہ بالکل غلط ہے۔

بقول یوحنا یسوع اپنے شاگردوں کو دو بار نظر آیا۔ اگرچہ وہ ایک مقفل دروازے سے گذر جاتا ہے، لیکن طامس یقین نہیں کرتا کہ وہ خداوند ہے جب تک وہ اس کے پہلو میں زخم نہیں دیکھ لیتا۔ اس کے بعد یوحنا ان لوگوں کو جلیل میں بھیج دیتا ہے۔ مگر باوجود اس امر کے کہ یسوع ان پر روح القدس دم کر چکا تھا (باب ۲۲) اور ان لوگوں کو گنہگاروں کو پاک کرنے کی قوتیں عطا کر چکا۔ وہ لوگ خلاف توقع اپنا وہی ذلیل پیشہ ماہی گیری اختیار کر لیتے ہیں۔

مندرجہ بالا پیغامات سے ظاہر ہے کہ اناجیل اربعہ تضاد کا خوفناک طومار ہے اور بنظر غائر دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ داستان ہو شربا پہلی صدی مسیحی کی گزشت ہے۔ خرافیات قدیمہ میں جیسی لغو باتیں ہوتی ہیں ویسی ہی داستانیں اناجیل میں بھی درج ہیں۔ اصلی واقعہ کے متعلق جو مختلف بیانات ہیں۔ ان میں اور بعد میں جو تحریفات اور وضعات کئے گئے ان میں کوئی بھی مطابقت یا ربط نہیں ہے۔

پولوس کا بیان

عہد نامہ جدید میں اناجیل اربعہ کے بعد حالات مسیح کے سلسلے میں تصانیف پولوس کا نمبر آتا ہے۔ اور خصوصاً اس کی کتاب اعمال۔ اس لئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ چلتے چلتے ایک تنقیدی نظر پولوس پر بھی ڈال لی جائے۔ کتاب اعمال کے مصنف نے بھوتوں، صور خیال یا اشکال سیمیادی کے متعلق انہیں باتوں کا ذکر کیا ہے۔ جو وہ انجیل لوقا میں لکھ

چکا تھا۔ ہاں مسئلہ رفع الی السماء پر وہ ضرور کسی قدر اضافہ کرتا ہے اور اس باب میں جو کچھ اس نے لکھا ہے وہ کسی دوسرے مصنف انجیل کو معلوم نہیں ہے۔

مصنف کتاب اعمال میں بیان کرتا ہے کہ یسوع اپنے شاگردوں کو لے کر ایک پہاڑ پر گیا اور وہاں سے وہ ہوا میں بلند ہوا حتیٰ کہ وہ ایک بادل میں غائب ہو گیا۔

پولوس کے خطوط سب سے پرانی تحریریں ہیں

پیروان یسوع اس واقعہ پر ایمان رکھتے تھے کہ یسوع مر کر پھر جی اٹھا۔ اور چند سال بعد تک اپنے مختلف دوستوں کے سامنے ظاہر کرتا رہا اور پطرس اور دیگر گیارہ (بعض جگہ بارہ لکھا ہے) حوارئین نے اسے دیکھا۔ کتاب اعمال میں ایک تقریر پولوس کی زبان سے ادا کی گئی ہے جو مقام الطالیہ معبد الیہود میں کی گئی تھی۔ اس تقریر میں پولوس نے صاف طور پر بیان کیا ہے کہ جن لوگوں نے یسوع کی تجہیز و تکفین کی وہ یہودی ارباب حکومت تھے اور واقعی طبعی حالات میں یہی توقع بھی کی جا سکتی تھی۔ اگر یہی واقعہ ہے تو یسوع کو بھی اسی گڑھے میں جو مصلوب شدہ مجرموں کے لئے تیار کیا گیا تھا' دفن کیا ہو گا۔ (ملاحظہ ہو کتاب اعمال باب ۱۳ آیتہ ۲۷ لغایتہ ۲۹)

"کیونکہ انہوں نے جو یروشلم میں رہتے ہیں اور ان کے حاکموں نے اسے نہ پہچانا اور نہ انبیاء کی وہ باتیں سمجھیں جو ہر یوم السبت کو پڑھی جایا کرتی تھیں۔ اس لئے انہوں نے اس کے خلاف فتویٰ دے کر ان باتوں کو پورا کر دیا اور جب وہ ان تمام باتوں کو جو اس کی نسبت تحریر تھیں پورا کر چکے تو انہوں نے اس کو دار پر سے اتار لیا اور اسے قبر میں دفن کر دیا۔"

مندرجہ بالا بیان سے ان تمام دلچسپ تفصیلات کی تردید ہو جاتی ہے جو اناجیل میں نظر آتی ہیں۔ اگر یہ حال (جیسا کہ عام خیال ہے) پولوس کے کسی ساتھی نے لکھا ہے تو یسوع کے مر کر جی اٹھنے کا اولین قصہ ان قصوں سے قطعی مختلف ہو گا۔ جو اناجیل میں درج ہیں۔ پولوس مذہباً یہودی تھا اور وہ شریعت موسوی سے بہ مقابلہ مصنفین اناجیل کے زیادہ واقف تھا۔ یہودیوں کا یوم السبت شنبہ ہے۔ اور سبت کے روز کام نہ کرنے کا حکم از روئے شریعت موسوی بعد غروب آفتاب ختم ہو جاتا ہے۔ پھر اتوار کی صبح تک انتظار کرنے کی کوئی ضرورت نہ تھی۔ (جیسا کہ انجیل مرقس میں بیان کیا گیا ہے)۔

علاوہ ازیں پولوس ہی ایک ایسا شخص ہے جو اس امر کا مدعی ہے کہ پانچ سو آدمیوں نے بیک وقت یسوع کو دیکھا۔ حالانکہ الحقیقت مسیح کے احیاء ثانیہ کا دیکھنے والا ایک گواہ بھی نہیں ہے اور نہ ان عورتوں اور مردوں سے میں سے جو یسوع کو قبر پر لے گئے تھے۔ کسی نے اس واقعہ کی نسبت اپنی کوئی تائیدی یا تصدیقی شہادت پیش کی۔

بعد کو ایک مصنف نے یوحنا کے نام سے ایک انجیل بنائی اور پھر کسی اور نے پطرس کے نام سے تیسری انجیل تصنیف کی جس میں یسوع کے احیاء ثانیہ کی ایسی مضحک تفصیلات درج کیں کہ پہلے زمانے کے عقیدت مند عیسائیوں نے بھی ان کو قبول نہ کیا اور وہ روایت ترک کرنا پڑی۔ جس کی رو سے پانچ سو آدمیوں نے یسوع کو دوبارہ زندہ ہوتے دیکھا تھا۔

اناجیل کے قدیم ترین ترجموں میں لکھا ہے کہ جب یسوع گرفتار ہوئے تو ان کے حواریین منتشر ہوگئے۔ اور اپنا پرانا مشغلہ ماہی گیری کا اختیار کر لیا۔ کچھ دنوں بعد انہوں نے دعویٰ کیا کہ انہوں نے خداوند' کو دیکھا ہے۔ (اس سے زیادہ کوئی تفصیل بیان نہیں کی) اور تبلیغ مذہب کرنے لگے۔ اگر ان کے اس دعویٰ کو تبلیغی مصلحت نہ سمجھا جائے تو بھی ایسے لوگوں کا جن کے دل مذہبی جوش سے معمور ہوں۔ مسیح کی روح کو دیکھ لینا' حیرت انگیز امر نہیں۔ کیونکہ روحانیات کا یہ معمولی مسئلہ ہے کہ جب کسی خیال کی طرف توجہ قوی ہوتی ہے تو خود انسان کا ذہن خلاق اسے مرئی صورت میں پیش کر دیا کرتا ہے۔ اس کا ثبوت اس واقعہ سے بھی ملتا ہے کہ سوائے رومن کیتھولک عیسائیوں کے کسی ایک پروٹسٹنٹ کو بھی مسیح گوشت و پوست کے ساتھ نظر نہیں آئے۔

مسیح اور پولوس

جن حضرات نے تاریخ مسیحیت کا بہ نظر غائر مطالعہ کیا ہے۔ وہ جانتے ہیں کہ ابتدائی تین صدی میں مسیحیت بری بھلی جو کچھ پائی جاتی تھی اس کا بانی دراصل پولوس تھا۔ اس کے بعد جو مسیحیت پورے طور پر منظم ہو کر قائم ہوئی اس کا بانی سینٹ امبروز تھا۔ وہ زمانہ ایسا تھا کہ تمام دنیا مذہب پر گفتگو کر رہی تھی۔ پرانے فرقے نابود ہو کر جدید مذہبی فرقے پیدا ہوتے اور مٹتے جاتے تھے۔ پولوس حقیقتاً نہایت پرجوش شخص تھا۔ اس کے دل میں بھی مختلف مذہبی خیالات پیدا ہوئے اور آخر کار وہ یسوع کا معتقد ہو کر پورے جوش

کے ساتھ مسیحیت کی تبلیغ کرنے لگا۔ پھریا تو اس کا غیر معمولی جوش تھایا عوام پر اثر ڈالنے کا خیال کہ اس نے آخر کار یسوع کو ابن اللہ بنا کر چھوڑا۔

مروجہ بائبل میں اناجیل میں جس قدر حصہ پایا جاتا ہے۔ ان کی نسبت کوئی ثبوت اُمر کا بہم نہیں پہنچ سکتا کہ وہ پہلی صدی میں موجود تھیں اور اس لئے ان پر اعتبار کرکے مسیح کے صحیح حالات یا ان کی سیرت مرتب کرنا حسن عقیدت سے زیادہ نہیں ہے۔

اناجیل میں یسوع مسیح کی کوئی تصویر دوسری سے نہیں ملتی۔ کہیں تو وہ بچوں سے محبت کرتا ہے اور کہیں ان کی ماؤں سے نفرت' کسی جگہ اسے بازاری عورتوں کا دوست دکھایا گیا ہے اور کہیں متنفر' الغرض جوں جوں زمانہ گذرتا گیا' یسوع ناصری کی مختلف تصویریں بنتی رہیں۔ کبھی وہ یسوع الطالیہ۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اب عیسائی دنیا میں یسوع کی ہستی وہم وخیال سے زیادہ کچھ نہیں رہی اور برنارڈشا وغیرہ تو اسے "پاگل" آدمی سمجھنے لگے۔ یوروپ میں عوام کو جس قدر بیگانگی جناب مسیح سے پیدا ہوگئی ہے۔ اس کا اندازہ ذیل کے ایک لطیف واقعہ سے ہو سکتا ہے کہ ایک بار کوئی پادری مزدوری پیشہ حلقہ میں مذہبی کتابوں کا بنڈل باندھ کر گیا اور فرداً فرداً ہر شخص سے پوچھنے لگا کہ "بھئی تم مسیح کو جانتے ہو؟" اس کا جواب ہر شخص نے سر ہلا کر نفی میں دیا۔ بالآخر ایک شخص نے دوسرے سے دریافت کیا کہ "یار یہ مسیح کون شخص ہے جس کی اس قدر تلاش ہو رہی ہے۔" اس نے جواب دیا کہ "کارخانہ میں کوئی کاریگر ہوگا۔ جس کا کھانا یہ شخص بغل میں دبائے پھرتا ہے۔"

مسیح کی ہستی سے انکار

پھر انجیل کی تاریخی کمزوری اور اس کے بیانات کے تضاد نے یہی نہیں کیا کہ خود عیسائیوں کو مسیح کو احیاء ثانیہ اور ان کے دوسرے بہت سے معجزوں کی طرف سے منحرف کردیا بلکہ بعض نے تو یہ بھی کہہ دیا کہ مسیح کی کوئی ہستی کبھی تھی ہی نہیں۔ چنانچہ ایک فرانسیسی ڈو پوائے (Dupuis) اپنی مشہور کتاب "ابتداء مذاہب" (Origin of Cults) میں لکھتا ہے کہ "دنیا میں جتنے مذاہب پیدا ہوائے ان سب کی بنیاد علم ہیئت کے قصوں پر ہے جن میں سورج اور آسمانی خدا کو بہت اہمیت دی جاتی تھی۔ اور اسی کے ساتھ کسی نہ کسی دیو کا مر کر زندہ ہونا بھی دکھایا جاتا تھا۔ حقیقت یہ ہے جب فصل خزاں

آتی ہے تو آفتاب کو زوال ہوتا ہے اور اس کی حرارت بھی کم ہو جاتی ہے۔ اسی حالت کو قدیم لوگوں نے سورج دیوتا کے مرنے سے تعبیر کیا۔ پھر جب فصل بہار آتی ہے تو آفتاب مائل بہ عروج ہوتا ہے اور اس کو سورج دیوتا کا احیاء ثانیہ سمجھا گیا۔ گویا "مرنا اور دوبارہ زندہ ہونا۔" تداخل فصلین سے عبارت ہے۔ پروفیسر مذکور نے بحث کرتے ہوئے آخر میں لکھا ہے کہ یسوع ناصری وجود فی الخارج تھا ہی نہیں بلکہ اس سے مراد صرف "آفتاب" ہے جو دوشیزہ بہار (کنواری مریم) کے بطن سے پیدا ہوتا ہے، فصل خزاں کا پلاطس (رومی گورنر) اسے گرفتار کر کے مصلوب کر دیتا ہے۔ (یعنی سردیوں کا موسم آ جاتا ہے اور عام عالم ٹھٹھر کے بے جان سا ہو جاتا ہے)۔ اور پھر کچھ دنوں کے بعد مائل بہ عروج ہوتا ہے جسے احیاء ثانیہ سمجھنا چاہئے)۔

عام طور پر کہا جاتا ہے کہ مسیح چرخ چہارم پر زندہ ہیں۔ لیکن اسی کے ساتھ جب ہم یہ دیکھتے ہیں فیثاغورث کے نظام ہیئت کے مطابق آفتاب کی جگہ چرخ چہارم ہے تو اس خیال کو اور تقویت ہوتی ہے کہ مسیح سے مراد آفتاب یا سورج دیوتا ہے۔

۱۸۳۵ء میں جرمنی کے ایک مشہور مذہبی عالم ڈاکٹر اسٹرس۔ (Strass) نے اپنی کتاب سیرۃ المسیح (Life of Jesus) میں ثابت کیا ہے کہ اناجیل میں جو سوانح، یسوع کے درج ہیں وہ تمامتر اصنام پرستوں کے مذہبی خرافیات سے ماخوذ ہیں۔

نصف صدی کا زمانہ گذرا کہ رابرٹسن، ممبر پریوی کونسل نے ثابت کیا کہ تاریخ میں یسوع ناصری کے نام کا کوئی شخص موجود ہی نہیں۔ ان کا نظریہ یہ ہے کہ اسلاف یہود میں یسوع نامی ایک غیر معروف دیوتا مانا جاتا تھا۔ جس سے بعد کو پراسرار ولادت، احیاء ثانیہ وغیرہ کے بہت سے لایعنی قصے منسوب کر دیئے گئے۔

تولین (Tulane) یونیورسٹی کے پروفیسر ڈبلو۔ بی۔ اسمتھ نے بھی اپنی کتاب (Eccedeus) میں مسیح کی تاریخی حیثیت سے انکار کیا ہے۔ تقریباً یہی خیال ایک جرمن پروفیسر ڈریوز (Drews) کا ہے اور فرانسیسی ڈاکٹر کوچو (Couchow) نے بھی اپنی کتاب "معمائے مسیح" (Enigma of Jesus) میں بھی ظاہر کیا ہے۔ انہیں کے ہم خیال پراسپر الفارق (Prosper Alfaric) وٹوریس ماشیورو (Machioro Vittoris) وغیرہ دیگر علمائے مغرب بھی ہیں جو یسوع کی ہستی کو صرف ایک فرضی اور

اصنامی ہستی سمجھتے ہیں۔

بر سر مطلب

یہاں تک ہم نے جو کچھ بیان کیا وہ صرف اناجیل سے متعلق تھا کہ ان کی تاریخی و مذہبی اہمیت کس قدر ہے اور خود معتقدین مسیح کس حد تک مجموعہ اناجیل پر اعتماد رکھتے ہیں۔ اب ہم اصل مدعا کی طرف آتے ہیں کہ جناب مسیح کے متعلق جو یہ تمام محیرالعقول روایتیں پائی جاتی ہیں ان کی حقیقت کیا ہے۔ اور ان کا ماخذ کیا ہو سکتا ہے۔

اس لئے ہم کو تھوڑی دیر کے لئے اس زمانے میں چلا جانا چاہئے کہ اس وقت لوگوں کے مذہبی مراسم اور دینی اعتقادات کی کیا کیفیت تھی۔ اگر آپ نے ایسا کیا تو بہ آسانی اس امر کا فیصلہ ہو سکتا ہے کہ جناب مسیح کی غیر معمولی صورت ولادت' واقعہ تصلیب اور دوبارہ زندہ ہو جانے کے متعلق جو کچھ مذہب عیسوی نے بتایا ہے یا انجیلوں میں (باوصف تمام تضاد و اختلاف کے) پایا جاتا ہے۔ وہ کوئی نئی بات نہ تھی عہد قدیم کا کوئی ملک اور مذہب ایسا نہ تھا۔ جس میں بالکل اسی قسم کی روایتیں مختلف دیوتاؤں کے ساتھ نہ منسوب کی جاتی ہوں اور ہر سال تہواروں میں ان روایات کی یاد کو بطور تمثیل تازہ نہ کیا جاتا ہو۔ چنانچہ ہم تفصیل کے ساتھ بیان کرتے ہیں کہ کن کن اقوام و ممالک میں اس نوع کے اعتقادات پائے جاتے تھے۔

فنیقیہ

بائبلوس۔ فینقیوں کا سب سے پرانا شہر تھا اور یسوع سے کم ازکم ایک ہزار قبل استارتہ دیوی کا عظیم الشان مندر کی وجہ سے بہت مشہور تھا۔ یہ مقام ساحل بحر کے قریب ایک بلند جگہ پر واقع تھا جہاں استارتہ دیوی کا ہیکل قائم تھا۔ یہ دیوی عشق و محبت کی دیوی سمجھی جاتی تھی۔ لیکن عشق و محبت بھی وہ جو جذبات عفیف سے بالکل معرا ہو۔

استارتہ کا افسانہ حسن و عشق پلوٹارک اور سائریل کی زبانی یہ ہے کہ فنیقیوں سے یہ قصہ مشہور تھا کہ سنائرس (فرمانروائے قبرص کا لقب تھا)۔ اپنی ایک حسین لڑکی مرہ (Myrrha) پر عاشق ہوگیا اور اس نے سالانہ جشن مسرت کے سلسلے میں اس سے مباشرت کی اور ایڈونی (Adoni) نامی ایک بچہ پیدا ہوا۔

بعد کو سنائرس اپنی اس قبیح حرکت پر سخت نادم ہوا اور اس نے اس بچہ کو ایک پہاڑ پر

پھنکوا دیا۔ لیکن یہاں اس خوبصورت بچہ کو جنگل کی دیویوں نے لے لیا۔ وہ بچہ پرورش پا کر نہایت ہی خوبصورت جوان نکلا۔ ایک روز وہ جنگل میں شکار کھیل رہا تھا تو استارتہ (Astrata) دیوی کی اس پر نظر پڑگئی اور عاشق ہوگئی۔ یہ بات دیکھ کر مریخ دیوتا جو استارتہ یا وینس کا عاشق تھا۔ بہت برہم ہوا اور اس نے ایک جنگلی سور کی صورت اختیار کر کے شکار کھیلتے وقت ایڈونی کو مار ڈالا۔ اس واقعہ پر استارتہ بے حد روئی پیٹی اور اس کے دل پر اس قدر استیلائے غم والم ہوا کہ وہ پاتال کو چلی گئی۔ جو مردوں کی دنیا کہلاتی ہے۔ لیکن یہاں پاتال کے راجہ پلوٹو (Ploto) جو ہندی علم الاصنام میں جمراج کہلاتا ہے' کی بیوی بھی ایڈونی پر عاشق ہوگئی تھی۔ اس لئے اس نے ایڈونی کو پاتال سے جانے نہ دیا۔ بالآخر دونوں دیویوں میں یہ مفاہمت ہوئی کہ سال کو دو فصلوں میں تقسیم کرلیا جائے اور ہر دیوی اس نوجوان کو ایک فصل یعنی چھ ماہ تک اپنے پاس رکھے۔ جب استارتہ دیوی نے واپس آکر یہ واقعہ احباب سے بیان کیا تو انہوں نے خوب جشن مسرت منایا۔ اور جس دن ایڈونی زندہ ہوا تھا اس روز ایک تہوار قرار پاگیا۔

سر جے۔ جی۔ فریزر ملک شام کی ایک خوبصورت وادی کا حال بیان کرتے ہیں جو مقام بائبلوس سے جانب مشرق کچھ فاصلہ پر واقع ہے۔ اس مقام کو قدیم زمانہ میں وادی ایڈونیس کہا کرتے تھے۔ یہی وہ وادی ہے۔ جہاں استارتہ کی ایڈونیس سے ملاقات ہوئی تھی یا جہاں اس نے اس کی پارہ پارہ لاش پر ماتم کیا تھا۔ (روایات مختلف ہیں)۔ اسی وادی میں ایڈونیس نامی ایک دریا بہتا ہے جو سیلاب کے وقت سال بھر میں ایک مرتبہ خونیں ہو جاتا ہے۔ کہتے ہیں کہ ایڈونیس کا خون ہے۔ (حالانکہ اس کے اسباب کیمیاوی ہیں)۔ اسی موسم میں سرخ پھولوں کی کثرت سے تمام وادی لالہ زار بن جاتی ہے۔ دوشیزگان شام یہاں آکر گریہ وبکا اور ماتم وزاری کیا کرتی تھیں۔ (جیسے کہ مریم نے یسوع کی قبر پر ماتم کیا تھا)۔ لیکن یہ کیفیت ایک خاص وقت تک طاری رہتی تھی۔ کیونکہ پھر ایڈونیس پاتال سے زندہ ہو کر واپس آ جاتا تھا۔ فنیقیوں نے جزیرہ قبرص میں بھی اپنا تمدن قائم کر دیا تھا۔ جو بائبلوس کے بعد مذاہب عشق و محبت کا دوسرا مرکز تھا۔ اسی جگہ سنائراس اور پگمالیون کے کارنامہ ہائے عشق و محبت کی روایت قائم کی گئی۔ جزیرہ قبرص میں جنوب مغربی سمت ساحل بحر سے تقریباً ایک میل کے فاصلے پر کوکلیا (Kokalia) نامی ایک حقیر سا موضع

اب بھی ہے جہاں ایڈونیس کے بہت سے بت پڑے ہوئے اب بھی ملتے ہیں۔ یہی موضع پہلے زمانہ میں شہر پافورس (Paphros) تھا۔ اسی پہاڑی پر یسوع سے ایک ہزار قبل بلکہ دو ہزار پیشتر یونانیوں کی آفرودتیہ یعنی استارتا دیوی کا خوبصورت مندر تھا۔ جہاں دیوی کی قمریاں اور فاختہ (جو آج کل معصومیت کی علامت ہیں)۔ مندر کے ستونوں پر کوکو کیا کرتی تھیں۔ صحن میں مخروطی شکل کا ایک میل سنگی یعنی "لنگ" نصب تھا جو عورتوں کو بتاتا تھا کہ دیوی کس چیز کی بھینٹ پسند کرتی ہے۔ یہ مقام بائبلوس کی ہوبہو نقل تھا۔ اور ہر سال ایڈونی کی موت' پاتال کو جانے اور پھر زندہ ہو کر دنیا میں واپس آنے کا تہوار منایا جاتا تھا۔ یونانیوں کا اثر پڑنے سے یہی استارتہ دیوی کہیں آفرودیتہ اور کہیں وینس بن گئی۔ لیکن دنیا میں اس بھی پیشتر ایک اور مذہب "دیوی ماتا" یا "دھرتی ماتا" کا پایا جاتا تھا۔ جو دنیا کو بال بچے دینے والی ماتا تھی۔ اگرچہ کریٹ میں پہلے صرف یہی ایک دیوی تھی' لیکن آخری زمانہ میں اس جزیرے کے اندر بھی ایک نوجوان دیوتا داخل ہوگیا۔ یہی دیوی قدیم طیوطانی اقوام میں فریگا (Frigga) کہلاتی تھی جس سے ہفتہ کا دن "فریگاڈے یا فرائی ڈے" یعنی یوم جمعہ نکلا ہے۔ یہی دیوی روم میں جا کر وینس بن گئی۔ اس کو یونان میں آفرودیتہ اور مصر میں آئیسس کہتے تھے۔ یہی فنیقیوں اور عبرانیوں کی استارتہ تھی اور اسی دیوی کا اہل بابل اشتار کہا کرتے تھے۔ (یعنی زہرہ سیارہ) غالباً اسی سے انگریزی لفظ (Star) اور فارسی لفظ "ستارہ" نکلا ہے۔

بابل

فنیقیوں اور عبرانیوں میں جو استارتہ دیوی کہلاتی تھی وہی ہزاروں برس پہلے بابل کی اشتار دیوی تھی اور ایڈونی کے بجائے وہاں تموز دیوتا پایا جاتا تھا۔ جس زمانے میں اشتار و تموز کا مذہب رائج تھا یا عراق کی سمیری قوم کا نیر اقبال نصف النہار پر تھا۔ اور چونکہ یہ قوم نیم مغل تھی اس لئے تعجب نہیں کہ اشتار دیوی بھی وہی ہو جسے ملک چین میں شین شین مو (مقدس ماتا) کہتے تھے۔

بہرحال اشتار و تموز کے درمیان بھی محبت پائی جاتی ہے اور جب تموز مرجاتا ہے اور پاتال کو چلا جاتا ہے تو اشتار دیوی تلاش یار میں سرگرداں خطرات کا مقابلہ کرتی ہوئی پاتال تک پہنچتی ہے۔ جس وقت اشتار دیوی پاتال میں ہوتی ہے تو زرخیزی زمین اور تولید تناسل

کے تمام سرچشمے روئے زمین پر خشک ہو جاتے ہیں۔ (پاکستان میں بھی جب "سوکھ ڈو بجاتا ہے۔" یعنی زہرہ کا شرف نہیں ہوتا تو ہندوؤں میں شادی بیاہ نہیں کرتے یعنی تولید و تناسل کے سرچشمے بند ہو جاتے ہیں) قدرت کی تمام طاقتیں کمزور اور عشق و محبت کے تمام سلسلے معطل ہو جاتے ہیں۔ بالاخر دیوتا فانی انسان کی فریاد سنتے ہیں۔ پاتال کی رانی جو خود بھی تموز پر عاشق ہوگئی تھی۔ دیوتاؤں کے کہنے سننے سے مفاہمت کرلیتی ہے۔ اشتار پر امرت (آب حیات) چھڑکا جاتا ہے تو تموز کو اپنے ساتھ لے جانے کی اس کو اجازت دے دی جاتی ہے۔

یہی باعث تھا کہ خلیج فارس سے لے کر سواحل بحیرہ رزوم تک جن علاقوں میں سمیری تمدن رائج تھا وہاں تمام عورتیں تموز کی ایک آرتھی (تابوت) بنا کر ماتم کیا کرتی تھیں۔ اس کے بعد جب تموز کے دوبارہ زندہ ہونے کی مسرت انگیز خبر پھیلتی تھی تو صف ماتم کے بجائے عیش و طرب قائم ہو جاتی تھی۔ (ہندوستان میں یہ بسنت رت کا وقت ہوتا ہے)۔ آرتھی پر جو بت رکھا جاتا تھا وہ ایک نوجوان حسین دیوی کا ہوتا تھا۔ جسے سرخ لباس پہنایا جاتا تھا عورتیں اس لاش کو دریا پر لے جاتیں۔ اس کے جسم پر تیل ملتیں اور غسل کراتیں اور دف دنے کے ساتھ نوحہ خوانی کرتی تھیں۔ لمبے لمبے بال شانوں پر بکھیر لئے جاتے تھے جو ہوا میں پریشان ہو کر اڑتے تھے۔ گریہ وزاری کے ساتھ سینہ کوبی بھی ہوتی تھی اور بخور جلا کر دیوتا کی لاش کو دھوپ دی جاتی تھی۔ الغرض یہ تہوار اس قدر عام تھا کہ بقول حزقیل نبی شہر یروشلم کی عورتیں ہیکل سلیمانی سے قلیل فاصلہ پر بال کھولے ہوئے تموز کے بت پر نوحہ زاری اور سینہ کوبی کیا کرتی تھیں۔

بائبل میں تموز دیوتا کے مرنے اور جی اٹھنے کا تہوار ماہ تموز یعنی جون، جولائی میں منایا جاتا تھا۔ تہوار کا مقررہ دن ماہ تموز کا ساتواں روز ہوتا تھا۔ یہ بھی ایسا تھا جیسا عیسائی دنیا میں "یوم الارواح" یعنی (All Souls Day) ہوتا ہے (ہندوؤں میں بھی ایک ایسا ہی تہوار ہے جس میں ہر سال "پرکھوں" کو پانی کوؤں اور دیگر جانوروں کو کھانا دیا جاتا ہے)۔ تقویم یہود میں اب بھی اس روز فاقہ کیا جاتا ہے۔ گویا اس روز عام طور پر روحوں اور اپنے مردہ رشتہ داروں کی یاد تازہ کی جاتی تھی۔

عیسائیوں کا گڈ فرائڈے (Good Friday) اور یوم احیاء ثانیہ یسوع کی صبح اور

عید فصح یعنی ایسٹر (Easter) جس کا مادہ غالباً (Astar) ہے۔ انہیں قدیم روایات کی یادگار ہیں۔ اس سلسلے میں سینٹ جیروم کا وہ خط جو اس نے فلسطین سے پالینوس کے نام لکھا تھا۔ غالباً بہت دلچسپ ثابت ہوگا۔ وہ لکھتا ہے کہ:۔

"یہ ہمارا بیت اللحم جواب دنیا کا متبرک ترین مقام ہے کسی وقت تموز یعنی ایڈونیس کا باغیچہ تھا۔ اور جس غار میں شیر خوار یسوع پیدا ہو کر رویا تھا۔ اسی غار میں کسی وقت وینس دیوی کے معشوق کا ماتم ہوا کرتا تھا۔"

جو شخص اس واقعہ کو اتفاق سمجھے کہ مسیح اسی غار میں پیدا ہوئے۔ جہاں صدیوں پیشتر تموز کے مرنے اور جی اٹھنے کا تہوار منایا جاتا تھا۔ اس کی خوش عقیدگی پر جتنا بھی ماتم کیا جائے کم ہے۔

قوم حطی (Hiltites)

قدیم فلسطین یا فنیقیہ کے شمال حطیوں کی بھی ایک زبردست سلطنت تھی جس کا حال لوگوں کو بہت کم معلوم ہے۔ یہ قوم کسی زمانے میں اس قدر طاقتور ہوگئی تھی کہ انہوں نے بابل فتح کر لیا تھا۔ ہم کو حطی قوم کی ایک یادگار دستیاب ہوئی ہے جس پر تین شکلیں ہیں۔ ان سے آسمانی خدا۔ دھرتی ماتا اور ان کے بیٹے (دیوتا) مراد ہیں۔ اس سے یہ بات قرین قیاس معلوم ہوتی ہے کہ عیسائیوں کی تثلیث اسی حطی تثلیث سے پیدا ہوئی۔ علاوہ اس کے حطیوں میں دیوتا کے مر کر جی اٹھنے کا تہوار بھی موجود تھا۔

فریجیہ

سلطنت حطیہ کی جانب مغرب درہ دانیال تک فریجیہ کی سلطنت پھیلی ہوئی تھی۔ جہاں دیوتا کے قائیلہ (Cybela) اس کے معشوق دیوتا کا نام آ-تس (Attis) تھا۔ روایت ہے کہ پہلے یہ دیوتا ایک قبول صورت چرواہا تھا۔ جس پر قابئیلہ دیوی عاشق ہوگئی تھی یہ بھی روایت ہے کہ چرواہا بغیر باپ کے کسی کنواری کے پیٹ سے پیدا ہوا تھا۔ (یسوع بھی بغیر باپ کے کنواری کے بطن سے پیدا ہوئے اور وہ بھی مسیحی بھیڑوں کا چرواہا کہلاتے ہیں)۔

اس دیوتا کی موت کے متعلق دو روایتیں تھیں ایک تو یہ کہ اسے ایک جنگلی سور نے مار ڈالا تھا۔ (ایڈونیس کی نسبت بھی یہی روایت تھی)۔ دوسری روایت یہ تھی کہ اس نے

ایک صنوبر کے نیچے بیٹھے ہوئے اپنا عضو مخصوص کاٹ پھینکا۔ جس سے اس قدر خون بہا کہ وہ ہلاک ہوگیا۔ یہی باعث تھا کہ قابئیلہ دیوی کے بھگت اس کے تہوار کے دن اپنا آلہ تناسل نوچ لیتے تھے اور خونچکاں حالت میں اس کو سوئے آسمان اٹھایا کرتے تھے۔

تہوار کی صورت یہ تھی کہ ۱۷ مارچ کو دیوی کے پجاری ہاتھوں میں نرکل یانے لے کر بصورت جلوس نکلتے تھے۔ (جس طرح عیسائیوں میں "کھجور والا اتوار" یعنی (Palm Sunday) اور ۲۴ مارچ کو خون فشانی کا خوفناک دن ہوتا تھا۔ جبکہ بانسریوں' نرسنگھوں' جھانجھ' مجیروں اور دف وطنبورہ کے ساتھ نوحہ خوانی کا شور بلند ہوتا تھا۔ آتیس دیوتا کا جلوس نکالا جاتا تھا' اور پھر اسے اس مندر میں لے جاکر عارضی طور پر ایک خالی قبر میں رکھ دیتے تھے۔ (وہ کارروائی بالکل اسی طرح اور اتنے ہی عرصہ کے لئے ہوتی تھی جیسے آج کل رومن کیتھولک' گرجاؤں میں یسوع کی وفات پر یادگاری توشہ (Sacrament) عارضی طور پر کسی قبر کے اندر یا کسی علیحدہ مقام پر رکھ دیتے ہیں اور یہ تمام کارروائی "ہفتہ مقدس" یعنی (Holy Week) کے اندر ہوتی تھی۔ دوسرے روز (یا دو دن بعد) قبر کھولی جاتی تھی۔ اور آتیس کا بت نکال کر نہایت مسرت وشادمانی کے ساتھ لوگوں کو دکھایا جاتا تھا۔ گویا دیوتا مرکر زندہ ہوگیا۔ (یسوع کے متعلق بھی یہی کہا جاتا ہے کہ مصلوب ہونے کے دو دن بعد قبر سے زندہ ہو کر اٹھے)۔

الغرض یہ ایک سالانہ تہوار تھا۔ جس میں ناٹک کی طرح ایک خوبصورت اور نوجوان دیوتا کا مرکر جی اٹھنا دکھایا جاتا ہے۔ اور یہ رسم ایک مرکز سے چل کر اس وقت تمام دنیا میں پھیل گئی تھی۔ اس لئے ناممکن تھا کہ یسوع کے زمانہ میں شہر تارسوس (Tarsus) کا رہنے والا پولوس۔ آتیس دیوتا کے مرکر جی اٹھنے کا سالانہ تہوار کو نہ جانتا ہو جو اس وقت تمام رومی اور یونانی دنیا میں مشہور تھا کہ وہ ایڈونیس کے مرکر جی اٹھنے کے سالانہ تہوار کو نہ جانتا ہو جو اس کے شہر میں تھوڑی دور کے فاصلہ پر مقامات بائبلوس اور پافورس میں منایا جاتا تھا۔ اگر یہ شخص اتفاق سے محققانہ طبیعت بھی رکھتا تھا تو وہ بھی جانتا ہوگا کہ جس دیوتا کو ایڈونیس کہتے تھے وہ بابل کی عظیم الشان سلطنت کا "خداوند تموز" ہی تھا اور اگر یہ شخص یہودی تھا تو وہ یہ بھی جانتا ہوگا کہ خود یہودی قوم عرصہ دراز تک تموز کی موت پر ماتم اور اس کے پھر جی اٹھنے پر اظہار مسرت وشادمانی کرتی رہی تھی۔

مصر قدیم

جو رسمیں ایشیائے کوچک میں مرگ ایڈونیس پر ادا ہوتی تھیں وہی مصر قدیم اوسیریز (Osiris) کی موت پر ادا کی جاتی تھیں۔ قدیم مصر میں اس دیوتا کا وہی مرتبہ تھا جو مسیحی دنیا میں یسوع کا تھا۔ پہلی صدی عیسوی میں حکیم پلوٹارک نے مصری دیوتا اوسیریز و آئیسس پر ایک کتاب لکھی تھی' جس میں اس نے روایت کا جو مصر میں رائج تھی مفصل ذکر کیا ہے۔ بلکہ اسی سلسلہ میں مذہب آئیسس (Isis) کے متعلق بھی بہت کافی معلومات بہم پہنچا دی ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ آئیسس کے پجاری سر منڈاتے بلکہ چارابرو کا صفایا کرا دیتے تھے اور ہمیشہ سفید لباس پہنتے تھے۔ وہ نہ کبھی گوشت کھاتے تھے اور نہ ترکاریاں استعمال کرتے تھے جو زمین کے اندر پیدا ہوتی ہیں جیسے آلو' شلجم' مولی' شکرقند وغیرہ۔ شراب ان کے گھروں میں کبھی نہ جاتی تھی۔ بلکہ وہ نمک بھی نہ کھاتے تھے۔ کیونکہ اس سے بھوک پیاس بڑھتی ہے۔ الغرض اس مذہب میں زہد و تقویٰ اس حد تک پہنچ گیا تھا کہ بقول حکیم پلوتارک بادشاہوں کا مادہ منویہ شیشہ کی نلکیوں میں لے کر عورت کے رحم تک پہنچایا جاتا تھا۔ تا..کہ عورت مرد کا جسم ایک دوسرے سے مس نہ ہو۔ اوسیریز اور آئیسس کے متعلق روایت یہ ہے کہ سورج دیوتا رع کے نطفہ اور آسمان کی دیوی نوط کے بطن سے ایک دیوتا پیدا ہوا جس کا نام اوسیریز خداوند نور تھا۔ ایک دن نوط دیوی دیوتاؤں کے ایلچی ثوث (Thoth) سے اختلاط کر بیٹھی۔ جس سے ایک حسین و جمیل دختر آئیسس (Isis) پیدا ہوئی۔ کچھ دنوں بعد آسمان کی یہ شوقین دیوی سیب (Seb) دیوتا یعنی زحل سے وابستہ ہو گئی۔ جس کے نطفہ سے سیت (Set) یعنی خداوند ظلمت پیدا ہوا۔ اوسیریز اور آئیسس دونوں ایک دوسرے کے دلدادہ تھے۔ جس سے سیت سخت برا فروختہ ہوا اور اس نے اوسیریز کو دغا سے قید کر لیا اور ایک سربمہر صندوق میں رکھ کر دریا میں پھنکوا (غالباً یہیں سے موسیٰ کو دریائے نیل میں پھینکنے جانے کی روایت لی گئی ہے) دیا۔ فرقت کی ماری حرمان نصیب آئیسس اپنے معشوق اوسیریز کو ہر طرف ڈھونڈھتی پھرتی تھی۔ کچھ عرصہ بعد اسے معلوم ہوا کہ لاش کا صندوق دریائے نیل میں بہتا ہوا سمندر میں چلا گیا اور وہاں موجوں نے تھپیڑے دے کر ساحل شام پر بمقام بائبلوس پہنچا دیا ہے۔ صندوق جا کر ایک درخت میں لگا جو اس کی برکت سے اس قدر پھلا پھولا اور پھیلا کہ وہاں کے بادشاہ نے اسے پسند

کر کے کٹوا دیا اور اپنے محل میں ستون بنوا کر نصب کرالیا۔ آئیسس دیوی لاش کی تلاش میں بائبلوس پہنچی اور وہاں سے بدقت تمام لاش کا صندوق اور ستون لے کر مصر واپس آئی۔ اس طرح مصر اور بائبلوس کا تعلق قائم ہوا۔

ایک روایت پلوٹارک نے یہ بھی بیان کی ہے کہ ایک روز آئیسس دیوی اوسیرز کی لاش پر لیٹ گئی جس سے ہوروس (Horus) پیدا ہوا۔ ایک دن آئیسس اپنے لڑکے ہوروس کو تلاش کرنے گئی تو سیت نے جسے لاش کا پتہ چل گیا تھا لاش چرائی اور اس کے چودہ ٹکڑے کر کے سب کو ادھر ادھر پھنکوا دیا۔ آئیسس نے لاش کے ٹکڑے بڑی محنت سے تلاش کئے اور سب سے بڑے دیوتا رع نے رحم کھا کر اوسیرز کو زندہ کر دیا۔ اور اسے پاتال کا بادشاہ بنا دیا۔ اس طرح مصری دیوتا اوسیرز مر کر زندہ ہوا۔

یہ روایت نہ صرف ہر مصری بچہ کی زبان پر جاری تھی بلکہ ہر سال نہایت شان وشوکت کے ساتھ اس کا ڈرامہ کھیلا جاتا تھا۔ ماہ نومبر میں جو مصر میں فصل ربیع کی تخم ریزی کا وقت ہوتا ہے۔ بمقام سائیس (Sais) یہ رسم ادا ہوتی تھی۔ اول تو چار دن تک اوسیرز کی موت پر خوب ماتم کیا جاتا تھا۔ پھر تین دن بعد پجاری لوگ ایک طلائی صندوق لے کر دریا پر جاتے صندوق میں پانی ڈالتے اور پھر نعرہ ہائے مسرت وشادمانی بلند ہوتے کہ اوسیرز مل گیا ہے۔ بہرحال اس کے معنے خواہ کچھ ہوں لیکن یہ ظاہر ہے کہ اہل مصر زمانہ نامعلوم سے ایک مصیبت زدہ، مقتول اور پھر زندہ ہونے والے دیوتا سے بخوبی واقف تھے۔

ایران قدیم

ہم نے ابھی تک ایران کے بارے میں کچھ نہیں لکھا۔ یہی وہ سلطنت تھی جو بابل۔ اشوریہ اور مصر کے زوال کے بعد اس وقت کی تمام متمدن دنیا پر غالب آگئی تھی۔ اور اس کا مذہب مدائن (Persipolis) سے لے کر جزائر برطانیہ تک اس وقت پھیلا ہوا تھا جبکہ دین عیسوی نہایت ہی کمزور وضعیف حالت میں پایا جاتا تھا۔

ان دنوں ایران کا مذہب مثرائیت (Mithraism) تھا جو دین عیسوی سے بہت پہلے کا مذہب تھا۔ جس کا عقیدہ تھا کہ گناہوں سے نجات دلانے والی ایک ہستی ہے جو بغیر باپ کے کنواری ماں کے پیٹ سے پیدا ہوئی۔ اس دیوتا کی ولادت موسم کے وسط میں

(یعنی دسمبر کے آخری ہفتہ میں پیدائش یسوع کی طرح) ایک غار کے اندر ہوئی۔ مثرائیت کے مندر تارک الدنیا لوگوں سے معمور تھے۔ جہاں ہر سال معتقدین کے سامنے یہی تقریب ہوا کرتی تھی۔ یعنی دین مسیحی سے صدیوں پیشتر ہر سال یہ ڈرامہ ہوتا تھا کہ مثرا (Mithra) دیوتا نے جان دے کر لوگوں کے گناہوں کا کفارہ دیا اور پھر جی اٹھا۔ (یہی عقیدہ عیسائیوں کا بھی ہے)۔ اس کی ہر سال خوشیاں منائی جاتی تھیں۔

پادری فرمیکس میٹرنس نے اپنی کتاب "اغلاط مذاہب باطلہ" (Religion Errors of Profane) کے باب ۲۳ میں اس تقریب کا حال بیان کیا ہے :۔ "ماہ مارچ میں ایک خاص رات مقرر کر کے ایک بت ارتھی پر رکھا جاتا ہے۔ جس کا مذہبی بھجنوں کے ساتھ ماتم کرتے ہیں۔ جب اس مصنوعی نوحہ زاری اور ماتم سے ان کا دل بھر جاتا ہے تو پھر ایک روشنی اندر لائی جاتی ہے۔ اس کے بعد تمام ماتم گساروں کے منہ پر ایک پجاری تیل چپڑتا ہے اور آہستہ آہستہ یوں کہتا جاتا ہے :۔

"اے مر کر زندہ ہو جانے والے دیوتا کے پرستارو! خوشیاں مناؤ۔ کیونکہ اب تمہیں غم والم سے نجات مل گئی ہے۔"

یونان قدیم

قدیم یونانیوں میں بھی اس قسم کی بہت سی روایات پائی جاتی تھیں۔

قدیم یونانیوں کا خدائے عظیم ذیوس (Zeus) تھا اور جس طرح ہندوستان کا مہادیو کیلاش پربت پر رہتا تھا۔ اسی طرح قدیم یونان کا یہ خدا کوہ اولمپس پر رہتا تھا۔ ذیوس کی بیوی کا نام ہیرا دیوی تھا۔ لیکن اس کی ایک اور بھی محبوبہ تھی۔ جس کا نام ڈیمیٹر (Demeter) یعنی دیوتاؤں کی ماتا (دیوی ماتری) ڈیمیٹر کے بطن سے ایک حسین وجمیل لڑکی پرسیفونی (Peresephone) پیدا ہوئی جس کا دوسرا نام کوڑے یا کوڑا (Kora) بھی تھا۔ جس کے معنی "لڑکی" کے ہیں' (پنجابی زبان میں لڑکی کو کوڑی 'کڑی یا کڑیا کہنا کہیں اسی واقعہ سے تو تعلق نہیں رکھتا)۔ پاتال کا راجہ پلوٹو (Ploto) یعنی جمجراج اس لڑکی پر عاشق ہوگیا۔ نیک دل اور رحیم وکریم ذیوس کو اس کی حالت پر رحم آیا۔ اس لئے اس نے پلوٹو کو صلاح دی کہ چونکہ لڑکی کی ماں ڈیمیٹر دیوی اپنی بیٹی کو پاتال جانے کی ہرگز اجازت نہ دے گی۔ اس لئے بہتر ہوگا کہ کسی روز جب تمہاری معشوقہ پر

سیفونی چمنستان خلد میں سیر کو آئے تو تم اسے اڑا لے جاؤ۔ پلوٹو نے ایسا ہی کیا۔ لڑکی کی ماں ڈیمیز دیوی کو جب صاحبزادی کی گمشدگی کا حال معلوم ہوا تو وہ اس کی تلاش میں روتی اور دنیا بھر کی خاک چھانتی پھری۔ (اسی طرح آئیسس دیوی اوسیرز کو' اشتار دیوی تموز دیوتا کو اور یہودی عورتیں یسوع نصاریٰ کو ڈھونڈھتی پھرتی تھیں)۔ بالاخر اسے معلوم ہوگیا کہ پرسیفونی کہاں ہے۔ اس کے بعد اس نے ذیوس کی منت سماجت کی کہ اس کی لڑکی واپس دلائی جائے۔ ذیوس نے رحم کھا کر پلوٹو کو حکم دیا کہ وہ پرسیفونی کو واپس کر دے۔ پلوٹو نے بادل ناخواستہ منظور کرلیا۔ لیکن جانے کی اجازت دینے سے پہلے پلوٹو نے پرسیفونی کو ترغیب دی کہ وہ ایک انار کھالے۔ (یونانی روایات کے مطابق انار کھانے کا مطلب یہ تھا کہ پرسیفونی انار کھا کر پاتال کی مستقل باشندہ ہو جائے)۔ بہرحال آپس میں یہ مفاہمت ہوگئی کہ پرسیفونی چار ماہ تک اپنے عاشق پلوٹو کے پاس پاتال میں گذارے اور بقیہ آٹھ ماہ اپنی والدہ ڈیمیز دیوی کے پاس رہے۔

قدیم یونان کی دوسری روایت اس سے بھی دلچسپ ہے۔ وہ اس طرح ہے کہ خداوند ذیوس (آسمانی خدا یا باپ) کی طبیعت ایک حسین و جمیل دوشیزہ لڑکی سمیلہ (Semele) پر مائل ہوگئی۔ دونوں میں اختلاط ہوا تو اس کنواری ماں کے پیٹ سے ایک لڑکا (دیوتا) پیدا ہوا جس کا نام ڈیونی سوس (Dionususus) تھا۔ لیکن ذیوس کی بیوی ہیرا دیوی کو جب اپنے شوہر اور سمیلہ کی عشق بازیوں اور استقرار حمل کا حال معلوم ہوا تو بہت برا فروختہ ہوئی۔ اور اس نے چاہا کہ اس بچہ کو ضائع کر دے۔ اس لئے کنواری ماں سمیلہ کو بحالت سفر درد زہ شروع ہوا تو اسے غار کے اندر چھپ کر بچہ جننا پڑا۔ اور اس کے بعد بھی ہیرا کے خوف سے اس نوزائیدہ بچے کو خفیہ خفیہ کسی دوسری جگہ بھیج دیا۔ (آج کل یہی صورت ولادت یسوع ناصری کی بیان کی جاتی ہے)۔ مگر ہیرا دیوی نے دوسرے طریقے سے انتقام لیا۔ یعنی وہ جوش سے بھری ہوئی یا بحالت جنوں عین عالم شباب میں اس لڑکے کے پاس پہنچ گئی اور بس..... ! اس کے بعد وہ نوجوان دنیا بھر گھومتا پھرا۔ (واضح ہو کہ مسیح کے معنی بھی زمین کی پیمائش کرنے والا ہے)۔ وہ صاحب معجزہ ہوگیا۔ دریاؤں اور جھیلوں کو پیدل عبور کر جاتا تھا اور اس کے پاؤں خشک رہتے تھے۔ اسی قسم کے اور معجزات بھی وہ دکھاتا تھا۔ (یہی باتیں یسوع سے منسوب کی جاتی ہیں)۔ ڈیونی سوس دیوتا دو گونہ خصوصیات

کا مالک تھا۔ ایک تو وہ ہر جگہ تہذیب و تمدن پھیلاتا تھا' دوسرے جہاں جہاں وہ پہنچتا تھا۔ وہاں شراب و کباب اور سیہ مستیوں کا دور دورہ شروع ہو جاتا تھا۔ (یسوع کی امت آج کل یہی فرض ادا کر رہی ہے)۔

اس ڈیونی سوس دیوتا کا کیا حشر ہوا اس کی نسبت دو روایتیں بیان کی جاتی ہیں۔ ایک تو یہ ہے کہ وہ پاتال میں اترا اور وہاں سے اپنی ماں سمیلہ کو نکال لایا۔ اور پھر اسے ساتھ لے کر آسمان پر چڑھ گیا۔ دوسری روایت یہ ہے کہ اسے ٹائٹن (Titon) لوگوں نے پارہ پارہ کر دیا تھا۔ لیکن اسے پھر دیوتاؤں نے زندہ کر دیا اور وہ آسمان پر چلا گیا۔ (یسوع کے متعلق بھی یہی عقیدہ ہے)۔

جب ڈیونی سوس دیوتا کا تہوار منایا جاتا تھا تو اسے ایک خوبصورت اور پیارے بچے کی صورت میں دکھایا جاتا تھا۔ اور اس کی ماں سمیلہ بھی اس کے پاس ہوتی تھی۔ (رومن کیتھولک گرجاؤں میں بھی کنواری مریم اور مسیح بچے کی بھی ایسی ہی خوبصورت تصویریں ہوتی ہیں)۔

یونان قدیم کی تیسری دلچسپ کہانی ہرقلیس (Herculus) سے یسوع کے پیدا ہونے اور آسمان پر چڑھنے کے قصہ کی پوری وضاحت ہوتی ہے۔

ہرقلیس بھی بغیر باپ کے کنواری ماں کے پیٹ سے پیدا ہوا تھا۔ جس کا نام القمینہ (Alcemene) جس کی ہرچند شادی ہو چکی تھی' لیکن کوئی منت مان لینے کی وجہ سے وہ ہنوز اپنے شوہر کے پاس نہیں گئی تھیں۔ (بعینہ یہی حالت یسوع کی ماں مریم کی تھی وہ بھی یوسف نجار سے منسوب ہو چکی تھی' لیکن منت ماننے کی وجہ سے بیت المقدس کی خدمت کیا کرتی تھی اور ابھی تک سسرال نہیں گئی تھی)۔ بہرحال مسماۃ القمینہ سے حالت دوشیزگی میں خداوند ذیوس نے ملاقات کی یا یوں سمجھئے کہ قادر مطلق خدا کی قدرت نے اس دوشیزہ عورت پر اپنا پر تو ڈالا اور حمل ٹھہر گیا۔ (بالکل یہی فسانہ ولادت یسوع کے متعلق بیان کیا جاتا ہے)۔ ذیوس کی بیوی ہیرا کو جب یہ حال معلوم ہوا تو وہ سخت ناراض ہوئی اور اس نے ارادہ کیا کہ اس بچے کو قتل کر ڈالے۔ اس لئے القمینہ نے کسی پوشیدہ جگہ جا کر وہ بچہ جنا اور اسے چھپا دیا۔ (یسوع ناصری کی ولادت بھی اسی طرح خفیہ طور پر ایک غار کے اندر ہونا بیان کی جاتی ہے)۔ ذیوس نے اپنی بیوی ہیرا کو سمجھا بجھا کر راضی

کرلیا۔ اور اس نے اس شرط پر کہ اگر وہ لڑکا جوان ہو کر اس کی بارہ شرطیں پوری کر دے گا تو وہ اس کی جان نہیں لے گی' مفاہمت کرلی۔ اس کے بعد ہفتخواں رستم واسفندیار کی طرح ہرقلیس نے بعض کارہائے عظیم انجام دیئے جن سے ہم کو کوئی تعلق نہیں۔ لیکن ہم کو ہرقلیس کے انجام سے خاص تعلق ہے یعنی یہ کہ اس کی بیوی نے اسے زہر دے دیا۔ ہرقلیس نے ایک بڑی چتا بنائی۔ اور اس میں بیٹھ کر ایک چرواہے سے کہا کہ وہ آگ لگا دے۔ اس کے بعد آسمان سے ایک ابر اترا اور ہرقلیس کے شاگردوں نے دیکھا کہ وہ اس ابر پر بیٹھ کر آسمان پر چڑھ گیا۔

اسی طرح صدیوں بعد فلسطین میں بنی اسرائیل کی ایک کنواری لڑکی کے بطن سے خفیہ طور پر غار کے اندر ایک لڑکا پیدا ہوتا ہے۔ جو بہت سے معجزے دکھاتا ہے۔ زہر دینے کے بجائے اسے صلیب دی جاتی ہے۔ وہ چتا پر بیٹھنے کے بجائے ایک پہاڑ کی چوٹی پر چڑھتا ہے۔ جہاں ایک لکہ ابر نمودار ہوتا ہے اور اسے اٹھا لے جاتا ہے۔ اور وہ آسمان میں غائب ہو جاتا ہے۔ (تفصیلات کے لئے ملاحظہ ہو کتاب الاعمال جلد باب نمبر۹) یسوع ناصری کی نسبت بیان کیا جاتا ہے کہ وہ مردوں کو زندہ کر دیا کرتا تھا۔ لیکن حکیم اسقلیوس یونانی نے اتنے مردے زندہ کر دیئے تھے کہ خداوند زیوس نے اس کو اس خیال سے مار ڈالا کہ کہیں تمام فانی انسان موت سے نہ بچ جائیں۔ اس کے بعد زیوس نے اسقلیوس کو پھر زندہ کر دیا)۔ اور دیوتاؤں میں رہنے کے لئے اسے آسمان پر اٹھا لے گیا۔ (یسوع ناصری کا قصہ بھی بالکل ویسا ہی ہے)۔

الغرض جس جس دنیا میں مسیحیت نے جنم لیا۔ اس میں کوئی قوم ایسی نہ تھی جس کے یہاں کسی دیوتا کی پراسرار موت' احیاء ثانیہ ورفع الی السماء کا قصہ موجود نہ ہو۔ اور یونانیوں میں ہرقلیس کا قصہ بچہ بچہ کی زبان پر تھا۔ الغرض دنیا کی حالت یہ تھی کہ دفعتاً ایک جوشیلا اور زمانہ شناس یہودی مسمی پولوس ساکن شہر طارسوس اٹھا اور اس نے اس سے فائدہ اٹھایا۔ وہ یونانیوں سے کہتا ہے کہ ایک خدا کا بیٹا۔ کنواری لڑکی کے پیٹ سے پراسرار طور پر پیدا ہونے والا خدا' چند سال ہوئے مسلک یہودیہ میں ظہور پذیر ہوا۔ اس نے محیرالعقل معجزے دکھائے لوگوں نے اسے صلیب دے کر مار ڈالا۔ مگر وہ مر کر پھر زندہ ہوگیا اور ایک پہاڑ کی چوٹی پر سے لکہ ابر میں بیٹھ کر اپنے باپ کے پاس آسمان پر چلا گیا۔

یونانیوں کے نزدیک یہ کوئی نئی بات نہ تھی۔ انہوں نے ہرقلیس کی طرح اس افسانہ کو بھی سنا اور قبول کرلیا۔

یسوع کی طرح سے اور بہت سے دیوتا کنواریوں کے پیٹ سے پراسرار طور پر غاروں میں پیدا ہو چکے تھے۔ جس طرح یسوع ناصری پانی پر چلتے تھے اور ایک مرتبہ سواری کے لئے دو گدھے بھی طلب کئے تھے۔ اسی طرح صدیوں پیشتر یونانیوں کا دیوتا دیونی سوس پانی پر چلتا تھا اور اس نے بھی ایک مرتبہ دریا کو عبور کرتے ہوئے دو گدھوں میں سے ایک طلب کیا تھا جو اسے سوار کر کے خشکی کی طرح دریا کو عبور کرلیتا تھا۔

یسوع کی احیاء ثانیہ کی کہانی بھی دیگر ہمسایہ مذاہب سے لی گئی ہے۔ جس طرح ان کے دیوتا پاتال میں اتر گئے تھے۔ اسی طرح یسوع بھی تین روز تک قبر میں رہے جس طرح ان دیوتاؤں کی موت پر گریہ وزاری کی گئی۔ اسی طرح یسوع کی موت پر عورتوں نے ماتم کیا۔ اب رہا پہاڑ کی چوٹی پر چڑھنا بادل میں سوار ہونا اور آسمان پر چلا جانا سو یہ قصہ لفظ بلفظ ہرقلیس یونانی کی روایات سے لیا گیا ہے۔

مرکر زندہ ہونے کا اصلی مطلب

اب تک جو کچھ ہم نے لکھا ہے اس سے ناظرین کرام کو بخوبی معلوم ہوگیا ہوگا کہ جس ملک میں بھی دین عیسوی پہنچا۔ وہاں کسی کے مرکر زندہ ہونے کا عقیدہ ایک عام بات تھی مرکر زندہ ہونے والا عموماً کوئی دیوتا ہوتا تھا۔ تمام سرزمین عراق میں کلدانیوں کے شہرادر سے لے کر یروشلم تک اس دیوتا کا نام تموز تھا۔ فلسطین کے شمالی علاقہ اور اس سے بھی شمالی علاقوں میں اس دیوتا کو آتیس کہتے تھے۔ ایشیائے کوچک اور تمام فنیقی دنیا میں اس دیوتا کا نام ایڈونیس تھا اور ایرانی دنیا میں یہی دیوتا مترا کہلاتا تھا۔ اور ملک مصر میں اس دیوتا کو اوسیریز کے نام سے پکارا جاتا تھا۔ اس کا حریف سیت تھا جسے لوگ ملک الظلمات اور خداوند شر کہتے تھے۔

دیوتاؤں کے مرکر دوبارہ زندہ ہونے کے متعلق جس قدر روایات اور خرافیات ہم نے درج کئے ہیں۔ وہ دراصل تمثیلی قصے ہیں۔ جس کا اصلی مطلب نور و ظلمت اور خیرو شر کی ابدی جنگ ہے۔ جو دیوتا ہر سال مرکر زندہ ہوتا تھا وہ دراصل سورج ہے جو موسم سرما میں مرجاتا ہے۔ یعنی خط استوا سے جانب جنوب یا پاتال کو چلا جاتا ہے۔ اور پھر

وہی دیوتا فصل بہار میں زندہ ہو جاتا ہے یعنی آفتاب خط استوا سے جانب جنوب رجوع کرتا ہے۔ حیات و ممات کا دوسرا مطلب زمین کی قوت نمو کا سالانہ فنا ہونا اور فصل بہار میں پھر عود کر آنا ہے۔

اس وقت ہمارے سامنے دو باتیں زیر غور ہیں یعنی آفتاب کا عروج وزوال اور اس کے ساتھ قوت نمو کی کمی زیادتی۔ بعض اقوام پر ان دونوں میں سے ایک نے بمقابلہ دوسری کے زیادہ اثر کیا۔ مثلاً ایرانی دیوتا مثرا کی موت وحیات ثانیہ صاف طور پر "شمسی روایات" ہے اور دیمیزاور اس کی بیٹی کی کہانی صاف طور پر زمین کی قوت نمو کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ اسی طرح تموز۔ قابیلہ۔ آتیس کی روایات بھی صاف ہیں اوسیرز مصری خود سورج دیوتا تھا۔ اب غور طلب بات صرف یہ ہے کہ ان مختلف دیوتاؤں کے تہوار مختلف ممالک میں مختلف مہینوں میں کیوں منائے جاتے تھے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ قدرت کی کارفرمائیاں مختلف ممالک میں مختلف ہیں۔ مثلاً جو شخص کسی شمالی ملک یا مرتفع معتدل ملک کا رہنے والا ہے۔ اس کے لئے سورج کا زوال جس کے باعث جاڑے کی شدت ہو جاتی ہے زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔ جو لوگ جنوب میں رہتے ہیں ان کے لئے زوال آفتاب کسی قدر راحت بخش ہے اور سال کے زیادہ حصہ میں نباتات کا مردہ رہ کر فصل بہار میں دفعتاً پھولوں کا نکلنا اور اناج کا پیدا ہونا۔ ان کے دلوں پر زیادہ اثرانداز ہوتا ہے لہٰذا ہم کو یہاں دونوں قسم کی روایات کا مرکب قصہ ملتا ہے جو چونکہ مختلف ممالک میں بہار اور برسات کا موسم مختلف ہوتا ہے۔ اس لئے مختلف ممالک میں یہ تہوار باوقات مختلف منائے جاتے تھے۔

یسوع ناصری کی اصلیت

ہم اس سے قبل یہ بیان کر چکے ہیں کہ فی زمانہ بہت سے فلسفی ایسے پیدا ہو گئے ہیں جو یسوع ناصری کے وجود ہی سے انکار کرتے ہیں اور دیوتاؤں کے مر کر زندہ ہونے اور آسمان پر چلے جانے کی روایات پر جو استدلال ہم نے کیا ہے اس سے یقیناً یسوع کا وجود ہی غائب ہو جاتا ہے مگر اس "دیوتا نژاد" یسوع کا وجود غائب ہوتا ہے جسے عیسائی خدا مانتے ہیں جس کی سوانح عمری اناجیل اربع میں لکھی ہے۔ اگر یسوع ناصری کا دنیا میں وجود تھا تو وہ کوئی دوسرا انسان تھا۔

قبل اس کے کہ حقیقت یسوع پر مزید بحث کریں ہم یہ بتا دینا چاہتے ہیں کہ یسوع سے پیشتر بھی دنیا میں زہد و اتقاو تجرد و رہبانیت تقویٰ و پرہیز گاری اور نفس کشی کا مذہب و مشرب موجود تھا۔ یہی باعث تھا کہ ملک یہودیہ میں یسوع ناصری سے بھی پیشتر ایک فرق ایسا پیدا ہو گیا تھا جو ترک دنیا اور زوایہ نشینی کے ساتھ زہد و ریاضت اور تجرد کی زندگی بسر کیا کرتا تھا۔ اس فرقہ کا نام عیسینی (ESSENE) تھا۔ (ممکن ہے اسی سے لفظ عیسیٰ اور عیسائی نکلا ہو) زوال بابل کے بعد جب یہودیوں پر ایرانیوں کا اثر پڑا غالباً اس وقت یہ فرقہ پیدا ہوا تھا۔ ایرانی مذہب میں پاکیزگی اور صفائی پر صحت زور دیا جاتا ہے۔ اور یسوع ناصری سے یقیناً پیشتر مذہب بوزیت (BUDHA) ملک یہودیہ میں پہنچ گیا تھا۔ جس کا یہودیوں اور یونانیوں اور بعدازاں عیسائیوں پر بہت اثر پڑا تھا۔ الغرض یسوع مسیح کے زمانہ میں فلسطین کی سرحد پر ان عیسینی راہبوں کی خانقاہیں موجود تھیں اور اس فرقہ کے بہت سے آدمی شہروں میں بھی رہا کرتے تھے۔ چنانچہ مورخ جوزلفیس نے اپنی کتاب "محاربہ یہود" جلد دوم باب ہشتم صفحات ۲ لغایتہ ۱۴ میں اس فرقہ کا حسب ذیل حال درج کیا ہے۔

"یہ عیسینی فرقہ عیش و عشرت کو گناہ سمجھ کر ٹھکرا دیتا ہے۔ صبر وضبط تجرد' رہبانیت اور نفس پر غلبہ حاصل کرنے کو نیکی سمجھتا ہے۔ یہ لوگ شادی نہیں کرتے لیکن شادی بیاہ کے فوائد سے وہ منکر بھی نہیں ہیں۔ کیونکہ اس سے بقائے نسل انسانی ہوتی ہے..... یہ لوگ مال و دولت کو حقیر سمجھتے ہیں۔ اور ان میں کوئی بھی ایسا نہیں جو بمقابلہ دوسرے ہم مشرب کے زیادہ دولت مند ہو۔ یہ لوگ کسی خاص شہر میں نہیں رہتے بلکہ ہر شہر میں رہتے ہیں اور جب کبھی ان کا کوئی ہم مشرب کسی دوسرے شہر سے مہمان آتا ہے تو کچھ میزبان کے پاس ہوتا ہے وہ سب پیش کر دیتا ہے۔ گویا وہ اسی کا مال ہے۔ اسی وجہ سے یہ لوگ سفر میں اپنے ساتھ کچھ بھی لے کر نہیں نکلتے۔ خواہ ان کو کتنا ہی طویل سفر درپیش ہو جو کپڑا ان کے تن پر یا جو جوتا ان کے پاؤں میں ہوتا ہے وہ جب تک پھٹ نہ جائے بدلا نہیں جاتا۔ یہ لوگ آپس میں خرید و فروخت نہیں کرتے بلکہ ہر شخص کے پاس جو چیز ہوتی ہے اس سے حسب ضرورت دوسرا شخص کام لے سکتا ہے۔ یہ لوگ بہت سادہ غذا کھاتے ہیں۔ کئی کئی بار غسل کرتے ہیں۔ محنت سے جان نہیں چراتے اور نماز و دعا میں مصروف رہتے ہیں۔ یہ لوگ بڑے وفادار ہوتے ہیں' جو بات ایک بار اپنی زبان سے کہہ دیتے

ہیں۔ اس سے کبھی نہیں ٹلتے۔ لیکن یہ لوگ قسم کھانے سے پرہیز کرتے ہیں بلکہ اسے برا سمجھتے ہیں۔ جب کوئی نیا شخص اس فرقہ میں داخل ہونا چاہتا ہے تو اسے دو سال تک امیدواری کرنا پڑتی ہے۔ پھر اسے اصطباغ دے کر دو سال تک مزید امتحان لیا جاتا ہے۔ اس کے بعد مرید کیا جاتا ہے۔ اور قبل اس کے کہ نئے آدمی کو اپنے دسترخوان پر بٹھائیں یا کھانے کو ہاتھ لگانے دیں وہ اس شخص سے سخت حلف لیتے ہیں کہ :۔

(۱) میں خدا سے ڈروں گا۔ اس میں کسی کو شریک نہ کروں گا۔ یعنی حقوق اللہ پوری طرح سے ادا کروں گا۔ (۲) آدمیوں کے ساتھ ہمیشہ نیکی اور انصاف سے پیش آؤں گا۔ یعنی حقوق العباد ادا کروں گا۔ (۳) کسی شخص کو خود اپنے دل سے یا کسی دوسرے کے کہنے سے ہرگز نقصان نہیں پہنچاؤں گا۔ (۴) بدوں سے ہمیشہ نفرت اور نیکوں کی اعانت کروں گا۔ (۵) ہر شخص سے محبت و وفاداری سے پیش آؤں گا۔ خصوصاً ارباب حل وعقد کی ہمیشہ اطاعت کروں گا۔ کیونکہ بغیر تائید ایزدی کے کسی شخص کو حکومت نصیب نہیں ہوتی۔ (۶) اگر میں خود صاحب الامر ہوں گا تو میں اپنے اختیارات سے ہرگز کوئی خلاف کام نہ کروں گا۔ (۷) ہمیشہ سچائی سے محبت کروں گا۔ (۹) اپنا ہاتھ چوری سے اور اپنی روح کو ناجائز خواہشوں سے پاک رکھوں گا۔

مندرجہ بالا تعلیم کو اگر غور سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ یسوع کی تعلیم نے اس میں کچھ بھی اضافہ نہیں کیا جو طور وطریق اور جو مشغلہ ان عیسینی راہبوں کا بتایا گیا ہے وہی زندگی مشغلہ یسوع ناصری کا تھا۔ دولت سے نفرت عصمت و طہارت' تجرد و رہبانیت غریبوں کی مدد۔ محبت بنی نوع انسان وغیرہ وغیرہ کی تعلیم یسوع نے بھی دی ہے۔ اب فرض کیجئے کہ اس فرقہ کا ایک شخص آزادانہ روح رکھتا ہے۔ لوگوں کو سمجھاتا ہے کہ خدا کی حکومت قریب ہے یعنی قیامت آنے والی ہے جب کہ ہر شخص کے اعمال تولے جائیں گے اس لیے گناہوں سے توبہ کرو۔ مجھے خدا نے تمہاری ہدایت کے لیے بھیجا ہے تو یہ شخص یقیناً یسوع ناصری تھا' یسوع ناصری بھی لوگوں کو قسمیں کھانے سے منع کرتا تھا۔

الغرض حقیقت مسیح یہ ہے کہ شہر ناصرہ کے رہنے والے ایک شخص یوسف نجار کا ایک بیٹا یسوع نامی بچپن ہی میں فرقہ عیسینی کے اندر داخل ہوگیا تھا۔ اس فرقہ کے لوگوں

سے یسوع نے ترک لذات، نفس کشی، نفرت کرنا سیکھا۔ ہمیشہ ایک لبادہ پہنے ہوئے قلندارنہ طور پر زندگی بسر کرتا رہا۔ اس کا نہ کوئی مقررہ گھر تھا نہ ٹھکانا۔ وہ کبھی دولت کی طرف آنکھ اٹھا کر نہ دیکھتا تھا۔ لوگوں سے اسے اس قدر محبت تھی کہ وہ بیماروں کا علاج کرتا تھا اور جو کچھ اس کے پاس ہوتا تھا دوسروں کو دینے سے ہرگز دریغ نہ کرتا تھا۔

اس یسوع کی طبیعت کسی قدر جوشیلی واقع ہوئی تھی۔ عیسینی فرقہ کے راہب اگرچہ رسمی قربانیوں سے انکار کرتے تھے۔ لیکن یسوع ایسی رسموں سے سخت متنفر تھا۔ اس نے ان یہودیوں کے خلاف وعظ تلقین کرنا شروع کر دیا۔ چونکہ اسے خود دولت سے نفرت تھی۔ اس لئے وہ بعض اوقات دولت مندوں کے خلاف بھی زہر اگلنے لگتا تھا اور چونکہ وعظ و نصیحت سے اسے کسی فائدہ کی طمع نہ ہوئی تھی۔ اس لئے ایسے بے غرض شخص کی باتیں سننے کے لئے مجمع کثیر جمع ہو جاتا تھا۔ وہ لوگوں کو قرب قیامت سے ڈرا کر انہیں متقیانہ زندگی بسر کرنے کی ترغیب دیتا تھا۔ اور کہتا تھا کہ اپنی روحوں کو یوم الحساب کے لئے تیار کرو۔ ممکن ہے کہ اپنی نفس کشی اور زہد و تقویٰ کی بناء پر وہ خود کو خدا کا بیٹا بھی کہہ بیٹھا ہو۔ اور یہی بہانہ لوگوں کو اسے سزا دینے کا ہاتھ آیا۔ یہودیوں نے اسے ستانا شروع کر دیا۔ اس لئے وہ رمتے جوگی کی طرح فلسطین سے غائب ہو گیا۔ نہ اسے کسی نے صلیب پر چڑھایا نہ کسی نے قتل کیا۔ اور یہی ہمارے نزدیک صحیح تاریخی واقعہ ہے۔ اس کے بعد لوگوں نے اناجیل اربعہ کی کہانیاں تصنیف کر کے اس متقی و پرہیزگار ناصح مشفق کو خدا کا بیٹا بلکہ خدا بنا دیا۔ اس کے سوانح حیات طلسم ہوشربا کے افسانے بنا دیئے گئے۔

O OO OO

مذہب سے انحراف

چونکہ مذاہب کا وجود علی الخصوص ان مذاہب کا جو اپنے آپ کو اخلاق ومعاشرت کا سرچشمہ سمجھتے ہیں۔ قدرتاً متاثر ہوا کرتا ہے وقت وماحول سے' اس لئے کوئی وجہ نہیں کہ انسانی تمدن تو قوانین ارتقاء کے تحت ترقی کر کے اور مذہب اپنے حال پر قائم رہے۔ کیونکہ یہ ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ انسان مذہب کے لئے پیدا نہیں ہوا بلکہ مذہب انسان کے لئے پیدا کیا گیا ہے۔ مذہب خود کوئی حقیقت نہیں ہے۔ بلکہ وہ ایک کیفیت وعرض ہے جو انسان کی دماغی تربیت' تمدنی ماحول اور نظام اجتماعی کے تحت لاحق ہوتی ہے۔ اس لئے اگر کوئی مذہب یہ دعویٰ کرے کہ اس کی اولین شریعت ہمیشہ یکساں طور پر ہر زمانہ وملک کی موافقت کر سکتی ہے تو اس سے زیادہ جھوٹ دنیا میں صرف یہ ہو سکتا ہے کہ ہم ایک وزنی چیز کو بلندی کی طرف پھینکیں اور کہیں کہ زمین اس کو اپنی طرف نہ کھینچے گی۔

خود انسان کی تاریخ پر آپ غور کریں گے تو معلوم ہوگا کہ سب سے پہلے اس پر لاکھوں برس کا وہ لامعلوم زمانہ گذرا جب اس میں اور ایک جانور میں قطعی کوئی فرق نہ تھا۔ اس کے بعد پانچ چھ لاکھ سال کا وہ زمانہ آیا جب اس نے پتھر کے بھدے آلات بنانا سیکھے۔ پھر حجری عہد عتیق آیا۔ جو تین چار ہزار سال تک قائم رہا۔ پھر مسیح سے ۲۰ ہزار سال قبل عہد حجری جدید شروع ہوا جو ساڑھے تین ہزار سال قبل مسیح تک جاری رہا۔ اس کے بعد عہد تاریخی شروع ہوا۔ جس کی ارتقائی صورت موجودہ تہذیب وتمدن ہے۔

انسان کے ان مختلف منازل ارتقاء میں مذہب کے اندر جس طرح تبدیلیاں ہوئیں ان کا ذکر ہم پچھلے صفحات میں کر چکے ہیں کہ اول اول مذہب کا خیال کس طرح صرف وہم وگمان پر قائم ہوا۔ اس کے بعد کیونکر مظاہر قدرت اور آثار فطرت کی طرف ذہن منتقل ہوا اور پھر اخلاق پر بنیاد رکھ کر کس طرح ان مذاہب کو پیدا کیا گیا جنہیں الہامی کہا جاتا

ہے۔ اس طرح ہم یہ بھی بتا چکے ہیں کہ مختلف ممالک کے مذہبی معتقدات میں بہ ادنیٰ اختلاف کس قدر مشارکت پائی جاتی ہے اور عقائد کی اشاعت کن اصول کے تحت کی گئی۔ جب تک انسان کا مذہب کسی مرتب ومدون صورت میں نہیں آیا وہ بالکل ذاتی و بے ضرر چیز تھا۔ لیکن اس کے بعد جب ایک مخصوص جماعت علم مذہب یا علم رسم ورواج جاننے والی پیدا ہوگئی تو اس نے اپنا اقتدار قائم کرنے کے لئے مذہب کو آلہ کار بنایا اور اول وقت سے لے کر تاایندم' کوئی زمانہ کوئی مذہب ایسا نہیں ہوا جسے اس نوع کے چھوٹے مدعیاں مذہب نے مجروح نہ کیا ہو۔

اس میں شک نہیں کہ اس جماعت کا یہ اقتدار عرصہ تک قائم رہا۔ لیکن جب علوم وفنون کی ترقی ہوئی' عقول انسان میں سمجھنے اور غور کرنے کی اہلیت پیدا ہوئی تو رفتہ رفتہ ایک جماعت ایسی ظاہر ہونے لگی۔ جس نے احکام مذاہب اور معتقدات پر غور کرنا شروع کیا اور آہستہ آہستہ فقہ علم کلام کی بھی بنیاد پڑی جو اپنی وسعت کے لحاظ سے کبھی مکمل نہیں ہو سکے گا اور جب تک ایک متنفس بھی مذہب کا ماننے والا موجود ہے اس کی تکمیل نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ علم کلام کی انتہا اسی صورت سے ہو سکتی ہے کہ مذہب سے انکار کر دیا جائے اور اس کی پابندیوں کو بالکل توڑ کر رکھ دیا جائے۔ وہم وخیال کی آپ کتنی ہی تاویل کرتے جایئے۔ وہم دخیال ہی رہے گا۔ اس لئے اس کا اختتام اسی طرح ممکن ہے کہ آپ وہم وخیال ہی سے گزر جائیں۔

یہ ہم بیان کر چکے ہیں کہ عہد قدیم کی قوموں میں اول اول بت پرستی کس طرح شروع ہوئی اور متعدد بتوں کا وجود مٹ کر کیوں کر صرف ایک بڑے بت کی ہستی قائم ہوئی۔ یہ گویا سب سے پہلا خیال تھا۔ جسے ہم ایک لحاظ سے توحید کہہ سکتے ہیں۔ لیکن چونکہ اس میں بھی کچھ مادیت پائی جاتی تھی۔ اس لئے فطرت انسانی مطمئن نہ تھی اور کبھی کبھی اس میں بغاوت کے آثار پائے جانے لگتے تھے۔ چنانچہ زردشت' کنفوشش اور بدھے انہیں لوگوں میں تھے جو مادیت سے علیحدہ ہو کر اپنے مذہب کی بنیاد قائم کرنا چاہتے تھے۔ اور اس میں کلام نہیں کہ اس وقت زمانے کے لحاظ سے جو کچھ انہوں نے کیا وہ بالکل وہی تھا' جیسے آج کوئی معقول پسندی کی بناء پر تمام مذاہب کی ضرورت سے انکار کر دے۔

عہد آخر کے مذاہب میں سب سے آخری مذہب جس کے بعد اسلام کا ظہور ہوا۔ اور جس نے غیر معمولی وسعت اختیار کی۔ عیسوی مذہب تھا۔ لیکن اس کی جو حالت ہوئی ہو تاریخ کا مطالعہ کرنے والوں سے مخفی نہیں اور حقیقت یہ ہے کہ اگر ہم غور سے اس کا مطالعہ کریں تو ہمارے لئے بہت کچھ سامان عبرت وبصیرت اس میں موجود ہے۔

میں نے اس وقت تک اسلام سے کوئی بحث نہیں کی اس پر سب سے آخیر میں بطور نتیجہ بحث کر کے بتاؤں گا کہ اس تلاطم خیال میں سکون پیدا کرنے والا صرف اسلام ہی ہو سکتا تھا۔ لیکن وہ اسلام نہیں جو آج کل پایا جاتا ہے اور نہ وہ اسلامی تعلیمات جو مولویوں۔ فقیہوں اور محدثوں نے ہمیں بتائیں بلکہ وہ تعلیم و تلقین جو فطرت نے بتائی' جو قرآن میں موجود ہے اور جو ایسی حقیقت وصداقت ہے کہ اگر اس کو سمجھ لیا جائے تو تمام انسانی تفرقے خواہ وہ تمدن مذہب سے متعلق ہوں' یا سیاسیات واقتصادیات سے فوراً مٹ سکتے ہیں اور ساری دنیا ایک ہی مقصود کو سامنے رکھ کر ایک ہی شاہراہ پر ہم خیال ہو کر گامزن ہو سکتی ہے۔

میں چاہتا ہوں کہ پہلے آپ کو عیسوی مذہب کے ارتقاء وزوال کے مناظر دکھاؤں جو آج دنیا کی متمدن ترین اقوام کا معمول بتایا جاتا ہے۔ کیونکہ اس مذہب کی تاریخ کا بہت بڑا اثر اسلام پر پڑا اور جو جو صورتیں کلیسہ واصحاب کلیسہ کے انہدام کی وہاں پیدا ہوئی تھیں وہی اب اسلام کے لئے پیدا ہو رہی ہیں جس طرح تمام مذاہب کی ابتدائی حالت میں معلمین مذہب کا اقتدار رہا ہے۔ اسی طرح مسیحیت میں بھی پادریوں کا اثر بہت قائم رہا۔ لیکن جب انہوں نے دین عیسوی کی رسم ورواج کی پابندیوں کا ایک طلسم بنا دیا۔ جیسا کہ کہ موجودہ اسلام میں پایا جاتا ہے تو لوگ رفتہ رفتہ اس سے گھبرانے لگے اور سب سے پہلے لیوتھر اور کالوین نے ایک جدید اصلاح یافتہ مذہب "پروتستانیت" (Prutestantism) کے نام سے قائم کیا۔ لیکن چونکہ یہ اصلاح بھی پوری طرح دل کو نہ لگتی تھی۔ اس لئے جب یوروپ میں دو رنسنت (Renaissance) شروع ہوا تو تعلیم یافتہ اور روشن خیال لوگوں میں مذہبی عقائد ومسائل کی چھان بین بھی ہونے لگی اور انہیں معلوم ہوا کہ دنیا میں بہت سی باتیں ایسی ہیں جو نہ انجیل سے تعلق رکھتی ہیں نہ کلیسہ سے یہ وہ زمانہ تھا۔ جب روم میں عہد شہنشاہی کا خاتمہ ہو چکا تھا اور اطالیہ

سے یہ ذوق منتقل ہو کر رفتہ رفتہ فرانس اور انگلستان پہنچا اور وہاں بھی اسی قسم کے مباحث ہونے لگے۔ انگلستان میں شیکسپیر سے پہلے وہاں کے سب سے بڑے ڈرامہ نویس مارلو (Marlowe) سروالٹرریلے (Walter Raleigh) اور بہت سے دیگر روشن خیال لوگوں نے متشککین کا ایک کلب قائم کر رکھا تھا اور مذہبی امور پر بحث کیا کرتے تھے۔ جس وقت اطالیہ کی طرف سے ان خیالات کی تائید ہوئی تو تحقیق و تدقیق کا بازار زیادہ گرم ہوگیا اور جو باتیں بائبل میں درج تھیں ان کا ازروئے روایت مضحکہ اڑایا جانے لگا۔ اس وقت سیاح لوگ مختلف ممالک کا اکتشاف عمل میں لا رہے تھے پردہ اخفا سے ایسی ایسی نئی زمینیں برآمد ہو رہی تھیں جو مصنفین بائبل کے خواب میں بھی نہ آتی تھیں' دوسری طرف نگاہیں دوربینوں کے ذریعہ فلک الافلاک تک پہنچ رہی تھیں اور آسمان کے متعلق تمام پہلی معلومات لغو و مہمل ہو رہی تھیں۔

الغرض جدید معلومات کے سامنے مذہب کی قدیم معلومات پادر ہوا نظر آ رہی تھیں اور پرانے اعتقادات کا شیرازہ درہم برہم ہوا جاتا تھا۔ لوگ سمجھنے لگتے کہ جس چیز کو "الہامی" اور "ربانی" مذہب بتایا جاتا ہے۔ وہ درحقیقت معمولی بلکہ ادنیٰ دماغوں کے منتشر خیالات ہیں اور رفتہ رفتہ مذہب کی وقعت ان کے دلوں سے اس قدر محو ہوگئی کہ قومی اور ملی اغراض کے مقابلہ میں بھی اس کو نظرانداز کیا جانے لگا۔

چند دنوں میں متشککین' لاادریین اور معقولیین (Rationalists) کا ایک گروہ ہر ملک میں قائم ہوگیا۔ جنہوں نے آزادی کے ساتھ مذہب کے متعلق لکھنا شروع کر دیا۔ سترھویں صدی کے وسط سے لے کر اٹھارھویں کے وسط تک انگلستان میں بڑے بڑے زبردست لاادریہ مصنفین گذرے جن میں بہت زیادہ مشہور ہربرٹ (Herbert) بلاؤنٹ (Blount) ٹنڈل (Tindel) لارڈ شیفٹسٹری (Shaftestry) لارڈ پولنگبروک (Poling Broke) کولنس (Collins) وغیرہ تھے اب خشک میحیوں (Puritans) کا زمانہ گذر چکا تھا۔ ملک میں ہر جگہ آزادی ضمیر کا دور دورہ تھا۔ اور پادریوں کے اخلاق اس قدر گر گئے تھے کہ کلیسہ کے اسقف حرام کاری کو عیب نہ سمجھتے تھے اور امراء کی ناجائز اولادیں آسانی سے اسقف کا مرتبہ حاصل کر سکتی تھیں۔ اس زمانہ کی ملکہ انگلستان کیرولائن (Caroline) (۱۶۸۳ء - ۱۷۳۷ء) بھی اس قدر متشکک واقع

ہوئی تھی کہ اس نے مرتے وقت کلیسہ کا توشہ لینے سے انکار کر دیا۔ لوگ کہتے ہیں کہ اس نے دین عیسوی ترک کر دیا تھا۔ الغرض اس زمانے کے بڑے بڑے مدبرین اور صاحبان علم وفضل معقولیت پسند تھے۔ یہ لوگ بجز خدا کے معجزہ وحی وغیرہ کو نہیں مانتے تھے۔ اور اس وجہ سے ان لوگوں نے دین عیسوی ترک کر دیا تھا۔ قدیم کلیسہ کے معتقدین نے ان کا نام "کافر ملحد" رکھ دیا تھا۔ الغرض گذشتہ دو سو برس سے مخالفین مسیحیت کی ایک زبردست جماعت انگلستان میں چلی آ رہی ہے۔ اور جس قدر تعلیم بڑھتی جاتی ہے۔ اسی قدر اس جماعت میں اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ پریس کی ایجاد اور ارزاں کتب کی اشاعت نے ہر جگہ مذہب کے خلاف ہیجان پیدا کر دیا ہے۔

اصل قصہ یہ ہے کہ جب اٹھارھویں صدی میں صنعت وحرفت وتجارت کا بازار گرم ہوا اور ہر طرف امن وسکون قائم ہوا تو اشاعت علم وفنون کے ساتھ "عقلیت" (Rationalism) کو بھی ترقی ہوئی گٹے (Goete) شلر (Shiller) اور کانٹ (Kant) وغیرہ سینکڑوں شعرا اور فلسفی پیدا ہوگئے۔ جن کی دلنشیں شاعری اور شیوابیانیوں نے عوام کے دل میں جگہ کی اور مذہبی روایات کی عمارت متزلزل ہو کر زمین پر آ رہی۔

اسی زمانہ میں انگلستان کی طرح فرانس میں بھی آزادی کا دور شروع ہوا پروٹسٹنٹ جماعت کے قتل عام کے بعد فرقہ یسوئی (Jesuists) ملک سے نکال دیا گیا تھا۔ لوگ مذہبی فرقوں کے جھگڑوں سے تنگ آگئے تھے اور ان کا دل مذہب کی طرف سے بیزار تھا۔ فلسفیوں نے جدید معلومات کی بناء پر بائبل اور مسیحیت پر حملے کرنا شروع کر دیئے۔ اور اصحاب کلیسہ اس قدر برہم ہوئے کہ جب والٹیر (Voltaire) نے اپنے فلسفیانہ خطوط (Philosophical Letters) شائع کئے تو اس کی جلدوں کو فراہم کر کے جلایا گیا۔ اور غریب والٹیر کو جان بچانے کے لئے ایک نواب کے قلعہ میں پناہ لینی پڑی۔ لیکن اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ طبقہ علماء کی رہی سہی وقعت بھی لوگوں کے دلوں سے اٹھ گئی۔

والٹیر کا ہمعصر روشو (Rousseu) بھی موحد تھا اور اس نے اپنی تحریروں اور تقریروں کے ذریعہ سے مسیح کا حلہ تقدس چاک کر کے پھینک دیا اور لوگوں پر ثابت کیا کہ جس یسوع ناصری کو مسیحی دنیا خدا مان رہی ہے' اس میں ذرہ بھر بھی الوہیت نہیں تھی اور وہ خدا کا ایک سیدھا سادھا پرہیزگار بندہ تھا۔ الغرض یہ عقیدہ تمام فرانس میں پھیل گیا۔

اور وہاں سے ہسپانیہ و جرمنی وغیرہ پہنچا اور اس طرح اکثر بلاد یوروپ کا مذہب "والٹریت" ہو گیا۔ ہر جگہ درباروں اور بازاروں میں والٹیر کی تصانیف کا چرچا تھا اور سوسائٹی کا کوئی طبقہ ایسا نہ تھا جہاں اس کی کتابیں نہ پڑھی جاتی ہوں۔

مسیحی مقتدایان دین نے والٹیر کو دجال (Anti - Christ) کہا اور جس قدر ہو سکا گالیاں دیں۔ لیکن نتیجہ کچھ بھی نہ ہوا۔ دنیا اسی دجال کی پیرو ہوتی گئی۔ اسی زمانہ میں یوروپ کا اہم ترین واقعہ انقلاب فرانس کا تھا۔ جس نے اگرچہ قدیم نظام حکومت کو تہ و بالا کر دیا۔ لیکن سیاسی اور مذہبی آزادی کو اور تقویت پہنچائی۔ یہی وہ زمانہ ہے۔ جس نے تین نہایت زبردست اور سحر بیان اہل قلم طامس پین (Thomaspaine)' روشو (Rousseu) اور والٹیر (Voltaire) پیدا کیے یہ تینوں خدا پر ایمان رکھتے تھے لیکن وحی کے قائل نہ تھے۔

اس کے بعد یوروپ میں "مشککین" (Sceptics) کی ایک جدید جماعت پیدا ہوئی۔ جنہوں نے ایمان یا اللہ کو بھی بلائے طاق رکھ دیا یہ لوگ ملحد (Athhist) یا مادئین (Materialist) کہلائے۔ اس جماعت میں بڑے بڑے لوگ تھے۔ مثلاً دیدرو (Diderot) ہولباش (Holbash) قندورسے (Condorecet) اور ہلوی ٹیس (Helvetius) یہ جو فیلسوفوں کے نام سے مشہور ہوئے اور ان کی قیادت میں مذہب کے خلاف بغاوت برابر بڑھتی رہی۔

یہ ریب وشک کوئی "ہوا کا رخ" نہ تھا کہ مٹ جاتا۔ بلکہ توسیع علم وفنون کے ساتھ اس میں زیادہ شدت و عمومیت پیدا ہوتی گئی حتیٰ کہ فرانس کے "حکماء" کے تشکک پر گہرا علمی رنگ چڑھ گیا۔ اور فرانس کے مشہور فلسفی ڈیکارٹ (Decarte) نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ جانوروں میں کوئی ایسی چیز نہیں ہے جسے روح (Soul) کہا جا سکے اس کے نزدیک ایک بندر یا عقاب کا جسم مشین سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا۔

علاوہ ازیں ڈیکارٹ نے دنیا کے سامنے ایک نظریہ ارتقاء یہ بھی پیش کیا کہ تمام اجرام سماوی یعنی ثوابت وسیارگاں سدیم یا ذرات نور (Nebulaor cosmic Dust) سے پیدا ہوئے اور اس طرح گویا ذات واجب الوجود کی ہستی کو بھی غیر ضروری ٹھہرایا اٹھارہویں صدی کے آخر تک اس تحریک میں علمی رنگ زیادہ غالب آگیا اور بائبل کی نکتہ

چینی زبک علمی مشغلہ ہوگیا۔ یعنی لوگ اصل عبرانی بائبل کا بہت زیادہ غور و فکر سے مطالعہ کرنے لگے اور اس تجزیہ و تحلیل کا نتیجہ یہ نکلا کہ عبرانی عہدنامہ عتیق کا راز فاش ہوگیا۔ اور یہ بات ظاہر ہوگئی کہ قدیم صحف انبیاء بنی اسرائیل مختلف زمانوں کی تصانیف ہیں جن کو بہت کچھ تحریف و ترمیم کے بعد ایک جگہ مدون کر دیا گیا ہے۔ اور یہ کام مقتدایان دین یہود نے عیسیٰ سے چند صدی پیشتر کیا تھا۔ یہ ہے وہ چیز جسے بائبل کا انتقاد عالیہ کہا جاتا ہے۔ جس طرح ہم مختلف زمانوں کی اردو یا فارسی زبان میں تفریق و تمیز کر سکتے ہیں۔ اور سمجھ جاتے ہیں کہ یہ زبان دلی دکنی کی ہے یا میر کی۔ انشاء کی ہے یا داغ و غالب کی۔ اسی طرح جدید فن نقد کے ذریعہ سے قدیم صحف بنی اسرائیل یا تالمود کے زمانہ تصنیف کا تعین ہو جاتا ہے۔ جدید علوم خصوصاً نظریہ ارتقاء نے توریت کے باب پیدائش کی بری طرح دھجیاں بکھیر دیں ہیں اور اب چونکہ آثار قدیمہ کے اکتشاف سے صحیح تاریخی معلومات ہو چکی ہیں۔ اس لئے بائبل کے تاریخی نوعیت بھی خاک میں مل گئی ہے۔

اسی زمانے میں فن تاریخ نے بھی علمی صورت اختیار کرلی۔ ہیوم (Hume)' اور گبن (Gibbon) نے قدیم تاریخی روایات وحکایات کو معیار ورایت پر کس کر ایسی تاریخیں لکھیں کہ ان کے مقابلہ میں تمام قدیم تاریخی داستانیں کالعدم ہوگئیں۔ خصوصاً گبن کی تاریخ کے ایک باب نے جو "عروج مسیحیت" پر ہے۔ دنیا کی آنکھیں کھول دیں اور اس تحریک کو اور زیادہ تقویت پہنچائی۔ گبن ہی وہ شخص ہے جس نے سب سے پہلے عالم بشری کی تاریخ اساطیرالاولین سے خالی الذہن ہو کر لکھی۔ اور جس طرح مشہور فرانسیسی ماہر فلکیات لاپلے (Laplae) اور جرمن فلسفی وہیئت داں کانت (Kant) نے یہ نظریہ قائم کرکے کہ تمام اجرام سماوی یعنی ثوابت وسیارگاں "سدیم" یا "لطخات سحابیہ" یا "ذرات نور" (Nebula) کے ذریعہ سے پیدا ہوئے ہیں۔ کسی خالق السماد کی ضرورت باقی نہیں رکھی۔ اس طرح گبن نے بھی ثابت کر دیا کہ تاریخ انسانی میں بھی کسی خالق الارض کا ہاتھ نہیں ہے۔ الغرض جدید علم تاریخ نے تمام خرافی قصے صفحات تاریخ سے نکال کر پھینک دیئے اور ثابت کر دیا کہ تاریخ عالم نشوونما اصول ارتقاء کے تحت ہوا ہے۔

جدید علم تاریخ کا ایک اثر دنیا پر اور بھی ہوا۔ وہ یہ کہ دنیا قدیم یونانی ورومی تمدن وشائستگی کی مداح ہوگئی اور ان کے قدیم علوم وفنون از سرنو زندہ ہوگئے۔ اب تک مسیحی

دنیا قدیم یونانیوں اور رومیوں کو مشرک وبت پرست سمجھ کر سزا اور جہنم سمجھتی تھی۔ لیکن جدید علم تاریخ نے ثابت کر دیا کہ عہد نامہ جدید یعنی مجموعہ اناجیل میں ایک بھی پاکیزہ خیال یا تعلیم ایسی نہیں ہے جو اقوال افلاطون (Plots) یا حکماء "رواقین" (Epicurians) کی تعلیمات میں موجود نہ ہوں۔ اس انکشافات کے ارباب تشکیک کے ہاتھوں میں جدید حربہ دے دیا اور وہ اور بھی زیادہ قوی ہوگئے۔ اس کے بعد حفریات اثری (Archeological Excavations) کا دور شروع ہوا۔ جب نپولین اعظم نے مصر فتح کر لیا تو یوروپ کے صدہا علماء مصر پہنچ گئے۔ اور انہوں نے آثار برآمد کر کے بائبل کی تاریخ اور روایات کو اور بھی زیادہ مشکوک کر دیا۔ اس کے بعد جب حفریات بابل ونینوا سے دنیا کی آنکھیں کھل گئیں۔ اور یہاں کے آثار برآمد ہوئے تو مٹی کی تختیوں اوز منقوشات اشوریہ (Guniform) وغیرہ سے عجب وغریب تاریخی حالات معلوم ہوئے۔ یہ بات ثابت ہوگئی کہ انبیاء بنی اسرائیل نے جو روایات وحکایات دنیا کے سامنے الہامی کہہ کر پیش کر تھیں وہ درحقیقت روایات بائبل ونینوا کا مجموعہ ہیں جن کو مناسب ترمیم وتنسیخ کے بعد پیش کر دیا گیا۔ بائبل ونینوا میں جو روایات پانچ چھ ہزار سال پیشتر تھیں وہی درحقیقت "اسرئیلیات" بن گئیں۔ تخلیق عالم وپیدائش آدم' حوا' جنت عدن۔ ہبوط آدم طوفان نوح وغیرہ کی تمام اسرائیلی روایات لفظ بہ لفظ بابل روایات ہیں' ان انکشاف کے باعث قصص بابل سے لوگوں کا ایمان اٹھ گیا۔ اور وہ وحی والہام کے بھی منکر ہوگئے۔ اور جب انہوں نے توریت کی کتاب پیدائش کے حالات کو علم طبقات الارض کی روشنی میں دیکھا تو وہ بائبل سے اور زیادہ بدگمان ہوگئے۔ کیونکہ یہ روایات قدیم بابل ونینوا میں اس وقت رائج تھیں۔ جب عبرانیوں کو لکھنا پڑھنا تک نہ آتا تھا۔

آثار قدیمہ کے ساتھ ہی ساتھ فلسفہ نے بھی لوگوں کے خیالات میں انقلاب پیدا کیا۔ کیونکہ جب عقیدہ "الہیت" (Deism) نے وحی والہام کے عقیدہ کی بیخ وبنیاد کو متزلزل کر لیا تو لوگوں میں یہ رجحان پیدا ہوا کہ ہستی' روح اور وجود باری تعالیٰ کو منطقی دلائل کے ذریعہ سے ثابت کیا جائے۔ کیونکہ جب تک ان دونوں کا وجود ثابت نہ ہو جائے وحی والہام لاشے محض ٹھہرتے ہیں۔ یعنی وحی سے پہلے یہ ثابت کرنے کی ضرورت ہے کہ کوئی وحی بھیجنے والا موجود بھی ہے۔ الغرض فلسفیوں نے جملہ اسباب وعلل کو سامنے

رکھ کر بحث کی۔ بہت سے دلائل غیر اطمینان بخش ثابت ہوئے اور اس طرح عقائد مذہبی کو اور زیادہ صدمہ پہنچا۔

وہ آخری چیز جس نے عقائد مذہبی پر ضرب کاری لگائی سائنس ہے۔ مختلف علوم مساوالہ نے ستاروں، پھولوں، پتھروں، جانوروں، اعضاء جسمانی، جوہر مادی وغیرہ کی نسبت وہ رازہائے سربستہ منکشف کئے کہ دنیا محو حیرت ہوگئی۔ ہر شخص سائنس کی تعریف میں رطب اللسان ہوگیا۔ علاوہ ازیں سائنس نے وہ ہندسی وکیمیاوی ثبوت پیش کئے کہ ان پر کسی شخص کو شک وشبہ کی گنجائش باقی نہ رہی۔ اس لئے جب سائنس میدان میں آئی تو لوگ اس کی طرف اس قدر زیادہ مائل ہوئے کہ تاریخ یا فلسفہ کے بھی اتنے گرویدہ نہ ہوئے تھے۔ مذہب وسائنس کی آویزش اس وقت سے شروع ہوئی جب ڈارون کی کتاب (Darwin) "مصدر الانوع" (Origin of Scpecies) شائع ہوئی۔ ڈارون کا کمال یہ ہے کہ اس نے قانون ارتقاء کو اس خوش اسلوبی اور واقعاتی بنیاد پر پیش کیا کہ ہر شخص کی توجہ اس طرف مائل ہوگئی۔ پادریوں کو نظریہ ارتقاء سے اس لئے سخت مخالفت پیدا ہوئی کہ ازروئے بائبل آدم کی پیدائش کو صرف چھ ہزار سال گذرے ہیں۔ لیکن سائنس نے دنیا کے سامنے انسان کے بنائے ہوئے وہ آلات حجری پیش کر دیئے جو پندرہ بیس ہزار سال پیشتر کے بنے ہوئے ہیں۔ علاوہ ازیں بائبل کی طرف سے مینار بابل اور اختلاف السنہ کی روایات پیش کی جاتی ہیں۔ لیکن سائنس نے انیسویں صدی میں ایک جدید علم کی بنیاد ڈالی جسے عرف عام میں "علم الالسنہ" (Philology) کہتے ہیں۔ اس علم نے تحقیق وتدقیق کے بعد یہ ثابت کر دیا کہ سنسکرت، فارسی اور اکثر یوروپین زبانیں ایک دوسرے سے اس قدر گہرا تعلق رکھتی ہیں۔ گویا وہ سب ایک ہی قدیم زبان کی شاخیں ہیں۔ اور اسی طرح بائبل کی روایات دوبارہ اختلاف السنہ غلط قرار پاتی ہے۔

بائبل کا بیان ہے کہ خدا نے نوح کے زمانہ میں تمام دنیا کو تباہ کر دیا تھا۔ اور دنیا کی آبادی کو صرف چھ ہزار سال گذرے ہیں۔ لیکن سائنس نے دنیا کے سامنے طبقات الارض کی مدد سے ثابت کر دیا کہ کرہ زمین کی خشک سطح رفتہ رفتہ کروڑوں برس کے بعد بنی ہے اور زمین کی ساخت بھی قانون ارتقاء کے تحت ہوئی۔ بائبل کی پہلی آیت یہ ہے کہ ابتدا میں خدا نے آسمان اور زمین کو پیدا کیا لیکن فلکیات نے یہ ثابت کر دیا کہ اجرام

سماوی دفعتاً" نہیں بنے۔ بلکہ قانون ارتقاء کے تحت رفتہ رفتہ سدیم یا ذرات نور سے بنے ہیں۔

الغرض موجودہ زمانہ میں انسان کے قبل ودماغ دونوں مذہب سے باغی ہوگئے ہیں۔ اور اب ہم ایسی دنیا میں رہتے ہیں۔ جس کے زمین وآسمان بالکل نئے ہیں۔ بلکہ یہ کہنا نادرست نہ ہوگا کہ اب نسل انسانی ہی دوسری ہوگئی ہے۔ اور اس کی زندگی ومعاشرت ملل سابقہ کی زندگی سے قطعی جداگانہ ہے۔ اس کے آئین وقوانین کی توضیع وتسوید عرش بریں پر نہیں ہوئی۔ اس کا دستور العمل لوح محفوظ سے نقل ہو کر نہیں آیا بلکہ انہیں کے دماغ ان کو سوچتے اور انہیں کے فاؤنٹن پین انہیں ضبط تحریر میں لاتے ہیں۔

انسانی خیالات ومعتقدات کی کایا پلٹ سب سے زیادہ ان انکشافات نے کی ہے جو فلکیات سے متعلق ہیں۔ اب یہ امر بھی متحقق ہوگیا ہے کہ کس ستارہ کی عمر کتنی ہے۔ اگر "کن فیکون" کے ساتھ ہی تمام اجرام سماوی معرض ظہور میں آئے ہوتے تو خواہ وہ "سبع شدادہ" ہوتے یا نجوم لاتعداد ولاتحصے ان سب کی عمریں برابر ہوتیں۔ لیکن سائنس نے ثابت کر دیا ہے کہ مختلف ستاروں کی عمروں میں اربوں سال کا تفاوت ہے اور بہت سے اجرام سماوی ایسے ہیں جو ہنوز سحابی یا سدیمی حالت میں ہیں۔ گویا ہماری کائنات ہی نئی ہے۔ جس کی نہ کوئی ابتدا ہے نہ انتہا اور ہماری دنیاوی زندگی ابدی سلسلہ حیات کی ایسی حقیر کڑی ہے۔ جس کے لئے سوال وجواب۔ میزان وصراط اور بہشت ودوزخ کا طول عمل کوئی معنی نہیں رکھتا۔

اس سے قبل کا زمانہ وہ تھا جب لکھنا پڑھنا صرف مقتدایان دین تک محدود تھا۔ مسلمانان ہند چھوٹی قوموں کو سوا پارہ سے زیادہ قرآن اور "راہ نجات" یا "صبح کا ستارہ" سے زیادہ کچھ نہیں پڑھنے دیتے تھے اور ہندوؤں کے نزدیک تو کسی شودر کے کانوں تک وید منتر کا پہنچنا ہی گناہ عظیم تھا۔ لیکن اب دنیا بدل گئی زمانہ اور ہے۔ اب کوئی گاؤں اور قصبہ اسکولوں سے خالی نہیں ہے۔ بڑے بڑے شہروں میں درجنوں ہائی سکول اور متعدد کالج نظر آتے ہیں۔ قدم قدم پر یونیورسٹیاں دکھائی دیتی ہیں۔ کوئی قوم ایسی باقی نہیں جس نے اپنا جداگانہ ادارہ قائم نہ کرلیا ہو۔ جگہ جگہ بڑے بڑے کتب خانے اور دار المطالعہ قائم ہیں۔ ابتدائی تعلیم لازمی ہوگئی ہے اور چند سال بعد دنیا میں کوئی شخص ناخواندہ نہ رہے گا۔

لاسلکی وریڈیو نے زمین کی طنابیں کھینچ کر فاصلہ زمان ومکان کو محو کر دیا ہے اور ایک شخص دہلی یا لکھنؤ کے کسی مکان میں بیٹھ کر لندن' امریکہ اور جاپان کی باتیں اس طرح سن سکتا ہے گویا اس کے سامنے کوئی شخص جلسہ میں تقریر کر رہا ہے۔ الغرض اب دنیا بہ لحاظ علم وفضل بہت دور پہنچ گئی ہے اور ناممکن ہے کہ قدامت پرست مقتدایان کی حکومت عرصہ تک قائم رہے۔

پہلے برسوں میں ایک کتاب کی نقل ہوتی تھی۔ لیکن اب ایک دن میں لاکھوں نسخے تیار ہو سکتے ہیں۔ علاوہ ازیں سلسلہ نقل وحمل اس قدر ترقی کر گیا ہے کہ لندن کی چھپی ہوئی ایک کتاب دو ہفتہ کے اندر دنیا کے ہر گوشہ میں پہنچ جاتی ہے۔

الغرض اب نئی دنیا ہے اور نیا آسمان۔ ترکوں نے ادارہ خلافت کو ٹھکرا دیا ہے۔ حالانکہ وہ پانچ سو برس سے اس پر اپنی جانیں قربان کرتے چلے آتے تھے۔ ہندوستان میں جدید روح کے زیر اثر خود ہندوؤں نے بت شکنی شروع کر دی ہے اور پہلے جو پنڈت اور اونچی ذات کے ہندو شودر کے سایہ کو بھی ناپاک سمجھتے تھے اب وہ انہیں سے بغل گیر نظر آتے ہیں۔ چینیوں نے اپنی لمبی لمبی چوٹیاں کاٹ کر پھینک دی ہیں۔ اہل مصر اپنی معاشرتی' مذہبی اور سیاسی آزادی کے لئے جہاد کر رہے ہیں۔ افریقہ کے حبشی بھی اب اس قدر روشن خیال ہوگئے ہیں کہ وہ اپنی ملی حکومت کو علیحدہ قائم کرنے کی فکر میں ہیں۔ ایران وافغانستان جو اب تک مجتہدین اور ملاؤں کے جال میں پھنسے ہوئے تباہ ہو رہے تھے۔ اب رفتہ رفتہ آزاد ہو رہے ہیں۔ ریاست میکسکو کے لوگ مذہب سے اس قدر بیزار ہوگئے ہیں کہ وہ پادریوں کو نشانہ بندوق بنانے سے بھی دریغ نہیں کرتے اور ہزاروں گرجا غیر آباد ہو کر مسمار ہوتے جا رہے ہیں۔

یقیناً یہ دنیا کا بالکل نیا دور ہے اور آج تک ایسا ذہنی انقلاب کرہ ارض پر کبھی رونما نہیں ہوا تھا۔ اور نہ اصلاح معاشرت کا اس قدر زبردست جہاد اس سے قبل کبھی کیا گیا۔ اب مذہب کی جگہ "خدمت العباد" لیتی جاتی ہے۔ اور ہزاروں قسم کے ادارے خدمت بنی نوع انسان کے لئے کھلتے جاتے ہیں اب دنیا "دوزخ وجنت" کی حقیقت کو سمجھ گئی ہے۔ اب وہ نفس مطمئنہ کو اپنی جنت اور ضمیر کی لعنت وملامت کو اپنا جہنم جانتی ہے اب دنیا عبادت سے متنفر ہوتی جاتی ہے۔ وہ عبادت کو ایسا ہی سمجھتی ہے جیسے سلاطین وامراء کی

خوشامد۔ الغرض یہ دنیا ایک نئی دنیا ہے۔ ایک انقلابی دنیا ہے اور اس کے در ودیوار نعرہائے "انقلاب" سے گونج رہے ہیں۔

○ ○○ ○○

مذہب کا مستقبل

اس سے قبل ہم یہ بتا چکے ہیں کہ مذہب کی ابتدا دنیا میں کیونکر ہوئی اور عہد حاضر میں اس کے ضعف واضمحلال کے کیا اسباب ہیں۔ اس پر قیاس کر کے مستقبل کے لئے بہ آسانی یہ حکم لگایا جا سکتا ہے کہ مذہب جو عملی طور پر اب بھی تقریباً فنا ہو چکا ہے۔ اقتصادی وذہنی اعتبار سے بالکل محو ہو جائے گا اور ایک زمانہ آنے والا ہے جب مذہب کی تعلیمات واعتقادات کو اس نگاہ سے دیکھا جائے گا۔ جس طرح آج "سکون زمین وحرکت افلاک" کے نظریہ قدیم کو دیکھا جاتا ہے یا جس طرح ایک ماہر آثار قدیمہ پرانے کھنڈروں کو کھود کر بہت سے محو شدہ واقعات کو سامنے لاتا ہے۔

مذہب کو سب سے زیادہ صدمہ پہنچانے والے اسباب کیا ہیں اور کیا ہو سکتے ہیں۔ ان کا تفصیلی ذکر اس سے قبل آ چکا ہے۔ لیکن مختصراً یوں سمجھ لیجئے کہ دنیا کا ہر وہ قدم جو علم وحکمت کی طرف بڑھتا ہے۔ مذہب کو سو قدم پیچھے ہٹا دیتا ہے اور بدقسمتی سے مذہب کے پاس کوئی ایسا ذریعہ نہیں ہے جو ان کا مقابلہ کر کے اپنی ہستی کو قائم رکھ سکے۔

علم وفنون کے سلسلہ میں سب سے بڑا صدمہ مذہب کو جس چیز سے پہنچا وہ قانون ارتقاء کی تحقیق تھی۔ اس نے نہ صرف مذہب کے بہت سے مسلمات تاریخی کو پارہ پارہ کر کے رکھ دیا۔ بلکہ خود مذہب کے اندر اسی اصول ارتقاء کے تحت تغیر وتبدل کا ہونا فطری اقتضاء قرار پایا۔ جو لوگ اشاعت پر ہی اصل مذہب سمجھتے تھے۔ خود ان کے ایمان متزلزل ہو گئے اور انہوں نے بھی اس اصول کی قدامت مان کر مذہبی معتقدات میں تغیر وتبدل گوارا کیا۔

چونکہ مذہب کی بناء صرف یقین پر قائم ہے اور فطرت انسانی صرف ان باتوں کا یقین کرنا چاہتی ہے جو خود اس کے مشاہدہ وتجربہ میں ہیں۔ اس لئے کوئی وجہ نہ تھی کہ علمی مشاہدات وتجربات کے مقابلہ میں مذہبی بیانات کو ترجیح دی جاتی اور انسانی ضمیر ان پر

مطمئن ہو جاتا۔

اول اول جب مذہب و حکومت میں زیادہ فرق نہ تھا اور حکومت کے مفہوم سے اس کی مذہبیت کو جدا نہیں کر سکتے تھے تو بربناء اس استبداد کے جو شخصی حکومتوں میں ہمیشہ پایا جاتا ہے۔ جبراً بزور شمشیر مذہب کا تلخ گھونٹ ہر شخص کو گوارا کرنا پڑتا تھا۔ اور قوت و عسکریت سے علم و حکمت کی تبلیغ اور آزادی فکر و ضمیر کو محو کیا جاتا تھا۔ چنانچہ تمام مذاہب کی تاریخ میں اس نوع سے سینکڑوں واقعات نظر آتے ہیں کہ مزخوفات مذہب کے خلاف جب کسی نے نکتہ چینی کی تو اس کو قید وبند میں ڈالا گیا' دار پر کھینچا گیا' جلایا۔ اور جس طرح ممکن ہوا حریت فکر ورائے کی اشاعت کو روکا گیا۔

جب یونان قدیم کے باشندوں نے ایران' کریٹ اور مصر والوں سے علوم وفنون کے حصول کا ذوق حاصل کیا' اور انہوں نے محسوس کیا کہ روایات مذہبی بالکل لغو چیز ہیں اور انسان کو خود اپنے عقل وحواس سے کام لے کر کسی نتیجہ پر پہنچنا چاہئے تو وہ جہاں بھی گئے۔ اسی خیال کو ساتھ لے گئے اور چونکہ یہ تاریخی صداقت ہے کہ جب کسی قوم میں آزادی اور تحقیق کی جستجو بڑھتی ہے تو مذہب کا انحطاط ہونے لگتا ہے۔ اس لئے اہل مذاہب نے ان کو ایک جگہ چین سے نہ بیٹھنے دیا۔ جب وہ ایتھنز(Athenes) پہنچے جو اس زمانہ کا بڑا عظیم الشان شہر تھا تو وہاں علم و حکمت کے ساتھ لوگوں کی دشمنی کو اور زیادہ شدید پایا' یہاں تک کہ انکساغورس نے جب وہاں ایک علمی درسگاہ قائم کرنا چاہی تو اس کی جان خطرہ میں پڑ گئی اور آخرکار اسے وہاں سے بھاگنا پڑا۔ (ایتھنز) کے فلاسفہ کا دعویٰ تھا کہ وہ صرف روحانی حقیقتوں کی طرف توجہ کرنا چاہتے ہیں' حالانکہ سقراط باوجود تبلیغ روحانیت اپنی جان سلامت نہ لے جا سکا۔

اس کے کئی صدیوں بعد اسکندریہ میں جسے یونانی مصری شہر کہنا چاہئے زیادہ موافق حالات کے تحت علم و عقل کی کارگاہ قائم ہوئی۔ ہرچند یہاں اتنے مذاہب پائے جاتے ہیں کہ خداؤں کی تعداد کے لحاظ سے پجاری بھی کافی نہیں تھے۔ لیکن شاید یہ مذہبی گمراہی کے ردعمل کا وقت تھا کہ اس کے بعد ہی لوگ چونکے اور علم و حکمت کی ترقی ہونے لگی۔ مگر بدقسمتی سے اسی وقت ایک اور نئے مسیحیت نے سیاسی اقتدار حاصل کر لیا اور اس نے یونانی عقل و حکمت کے آخری چراغ (۱) (Hayfpatia) کو گل کر کے رکھ دیا۔ پہلا

ایک ہزار سال کا زمانہ جو (۲) (Thales) شروع ہو کر (ہسپاٹینر) پر ختم ہو جاتا ہے۔ علم ومذہب کی جنگ کا نہایت اہم زمانہ ہوا ہے اور سب سے زیادہ جس مذہب نے عقل کی مخالفت کی وہ عیسوی مذہب تھا۔

حوالہ جات

(ا) یہ اسکندریہ کے ایک ماہر ریاضیات و فلکیات کی بیٹی تھی۔ چوتھی صدی عیسوی کے آخر میں پیدا ہوئی۔ اس کی فراست و دانائی کے سبب سے اسکدریہ میں اس کا خاص اثر تھا اور مشرق کے تمام حصوں سے طلبہ آ کر اس سے استفادہ کرتے تھے۔ اس نے فلسفہ اشراقیین اور فلسفہ ارسطو کو ملا کر ایک جدید فلسفہ انتخابیت (Electicicm) پیدا کیا تھا یہ فلکیات اور علوم میکانکی کی بڑی ماہر تھی۔ آخر کار وہاں کے اسقف اعظم نے بعض وحشی راہبوں کو متعین کیا جو اسے گاڑی سے کھینچ کر کلیہ میں لے گئے اور وہاں عریاں کر کے اس کے کوڑے مارے اور پھر ٹکڑے ٹکڑے کر کے جلا دیا۔

(۲) یونان کا نہایت قدیم فلاسفروں جو مسیح سے تقریباً سات سو سال قبل پایا جاتا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ یہ سب سے پہلا یونانی تھا جس نے تخلیق کائنات پر بحث کی اور بتایا کہ ہر چیز پانی سے پیدا ہوئی۔

ظہور اسلام

اس کے بعد صدیاں گذر گئیں اور علم کی روشنی مذاہب کے ظلمت کدوں میں نہ پھیل سکی۔ ہرچند علم و فراست کے تمام خزانے یونانی کتابوں میں محفوظ تھے۔ لیکن یونان کی عیسائی حکومت کے زمانے میں کس کو ان کے تلاش کی جرات ہو سکتی تھی۔

آخرکار اسلام کا ظہور ہوا اور اس نے عرب کے وحشیوں وہ انقلاب عظیم پیدا کیا۔ جس نے بعد کو دمشق وبغداد میں گہوارہ علم و حکمت کی صورت اختیار کی اور چاروں طرف سے عقل کی روشنی سمٹ کر وہاں آنے لگی۔ یونانی' ایرانی اور شامی علوم عربی زبان میں منتقل ہونے لگے اور مذہب اسلام نے ان کی اشاعت کو گوارا کیا ہو یا نہ کیا ہو' لیکن خلفاء امراء وسلاطین اسلام نے پوری ہمدردی واعانت سے کام لیا۔ دمشق وبغداد سے منتقل ہو کر یہ تہذیب شمالی افریقہ ہوتی ہوئی اسپین پہنچی اور وہاں علوم وفنون کی ترقی نے وہی رنگ اختیار کیا جو یونان قدیم میں کسی وقت پایا جاتا تھا۔ اس کے بعد چند یہودی و مسیحی سیاح یہاں آئے اور عربوں کے تراجم وتصانیف کو اٹلی' فرانس اور انگلستان لے گئے۔ پھرچونکہ مسلمان صقلیہ اور اطالیہ کے جنوب میں بھی آباد تھے۔ اس لئے یہاں سے بھی چشمہ علم یوروپ کی طرف بہا اور عقلیت کی ترقی ہونے لگی۔ لیکن کلیسہ نے جس قدر اس کی مخالفت کی وہ اس سے ظاہر ہے کہ بیکن کو اپنی آدھی زندگی زنداں کلیسہ میں بسر کرنا پڑی' البریٹ گریٹ کو کلیسہ کے اسقف اعظم کی خدمت دے کر خاموش کیا گیا۔ پر-لنکس نے فیثاغورس کے اصول کی تصدیق کا اس وقت تک اعلان نہیں جب تک وہ عذاب استطاق (Inquesition) کی دسترس سے باہر نہیں ہوگیا۔ آرنلڈ کا ایک مجرم کی طرح جابجا تعاقب کیا گیا۔ جین ڈی روکیوٹالڈ نے زنداں میں جان دی' سکواسکولی اور برونے جلائے گئے۔ گلیلو سخت عذاب میں مبتلا کیا گیا اور وسالیس مشکل سے اپنی جان بچا سکا۔ لیکن چونکہ دنیا میں عقل و حکمت کی بنیاد پڑ چکی تھی اور اس کا نشہ ایسا نہیں جو آسانی سے اتر

جائے اس لئے باوصف کلیسہ کی شدید ترین مخالفت کے اس کی اشاعت ہوتی رہی۔ یہاں تک کہ جب رفتہ رفتہ مذہب میں ضعف ہوا تو اتنی رعایت اہل علم کے ساتھ روا رکھی جانے لگی کہ کیمیا' طبیعات وفلکیات کی تعلیم پر ان کا آگ میں جلایا جانا بند ہوگیا۔

جب انیسویں صدی شروع ہوئی اور اسی کے ساتھ علم و حکمت کے اشعاعات نے ساری دنیا پر اثر ڈالنا شروع کیا تو مذہب کے سخت گیر دیوتا کا بت ٹوٹا۔ اور عقیدت نے توریت وانجیل میں تاریخی آثاری' علمی' اخلاقی ہزاروں قسم کے نقائص نکال کر مسیحیت کا جنازہ نکال دیا۔ اور اب پہلی دفعہ ارباب علم وفن نے اطمینان سے بیٹھ کر سمجھا کہ دنیا کیوں پیدا ہوئی اس کی تاریخ کیا ہے؟ مذہب کسے کہتے ہیں؟ اور اس کی الہامی حیثیت کس مصلحت کا نام ہے اور یہ آزادی خیال رفتہ رفتہ اس قدر بڑھی کہ اب گفتگو بائبل کے الہامی وغیرالہامی ہونے میں نہیں ہوتی بلکہ سوال یہ کیا جاتا ہے کہ بائبل ایسی لغو مہمل کتاب کو کیوں مدارس کے نصاب میں شامل کیا جائے اور یہ کہ آیا مسیح حقیقتاً کوئی وجود بھی تھا یا نہیں۔

جو لوگ بائبل کو مدارس سے خارج کرنا چاہتے ہیں۔ انہوں نے حسب ذیل دلائل پیش کئے ہیں۔

(۱) اگر بائبل الہامی ہے تو اس کا تعلق مذہب سے ہوا لیکن اب کسی ملک کا کوئی سرکاری مذہب نہیں ہے۔ لہٰذا کوئی ضرورت نہیں کہ بچوں کے معصوم دلوں میں تعصبات مذہبی پیدا کئے جائیں۔ اگر بائبل الہامی نہیں بلکہ انسان ہی کی تصنیف ہے تو اس میں کوئی ادبی خوبی نہیں ہے اور اس کو پڑھانا بچوں کا وقت ضائع کرنا ہے۔

(۲) بائبل دو ہزار برس قبل کی لکھی ہوئی کتاب ہے اور وہ زمانہ انسان کے عالم طفولیت کا تھا۔ اب انسان جوان ہے۔ لہٰذا کوئی ضرورت نہیں کہ بچوں کی سی باتیں جوانوں کو پڑھائی جائیں۔

(۳) بائبل خود کوئی کتاب نہیں بلکہ مجموعہ صحایف ہے جو مختلف زمانوں میں تصنیف ہوئے۔ علاوہ ازیں بائبلوں میں بھی فرق ہے یعنی عبرانی بائبل ۳۹ صحایف پر مشتمل ہے۔ انگریزی پروٹسنٹ بائبل میں صرف ۳۶ صحایف ہیں۔ رومن کیتھولک بائبل میں ان سب کے علاوہ ایک صحیفہ موسوم بہ "ابو قریفہ" (Apocary ph) اور بھی ہے۔ اس طرح

سب ملا کر ۷۲ صحایف ہو جاتے ہیں ایسی حالت میں یہ سمجھنا مشکل ہے کہ کون سا مجموعہ صحیح ہے۔ لہٰذا ایسی مشتبہ کتاب کا پڑھنا مضرت رساں ہے۔

(۴) اصلی بائبل عبرانی زبان میں تھی۔ رائج الوقت بائبلیں اس کا ترجمہ ہیں ترجمہ میں معانی اکثر بدل جاتے ہیں۔ لہٰذا اگر بائبل پڑھی جائے تو اصل پڑھی جائے ترجمہ کا پڑھنا فضول ہے اور چونکہ اسکول کا ہر بچہ عبرانی نہیں پڑھ سکتا اور نہ ایک مردہ زبان کے پڑھانے کی ضرورت ہے۔ لہٰذا بائبل کے ترجمہ کا درس موقوف کیا جائے۔

(۵) بائبل میں ایسی باتیں لکھی ہیں جو علوم وانکشافات جدیدہ سے غلط ثابت ہو چکی ہیں۔ لہٰذا غلط کتاب کا بچوں کو پڑھانا ان کے ذہنی رجحانات کو تباہ کرنا ہے۔

(۶) بائبل کے مختلف صحیفے مختلف حیثیت رکھتے ہیں۔ ان میں غزلیں بھی ہیں۔ قصے کہانیاں بھی ہیں۔ ڈرامے بھی ہیں۔ روایات بھی ہیں۔ خرافیات بھی ہیں اور تھوڑی سی تاریخ بھی ہے۔ اور یہ سب مختلف زمانوں کی تصانیف ہیں لیکن پڑھاتے وقت بچوں کو ان کی نسبت کچھ نہیں بتایا جا سکتا۔ اس لئے ایسی مجہول کتاب کی تعلیم میں وقت کو ضائع کرنا ہے۔

(۷) بائبل میں بہت سے معجزات درج ہے۔ جو ازروئے سائنس خلاف فطرت ہیں۔ ان کے پڑھنے سے بچوں میں توہم پرستی پیدا ہوتی ہے جو عقل ودماغ کے لئے مضر ہے۔

(۸) سائنس نام ہے عقل منظم اور دانش مرتب کا لیکن بائبل نام ہے خلاف عقل باتوں کا مجموعہ کا۔ اس لئے ظاہر ہے کہ عقلی پر بے عقل کو کیونکر ترجیح دی جا سکتی ہے۔

(۹) بائبل مجموعہ اضداد ہے اور اس لئے وہ کوئی اخلاقی تعلیم بھی صحیح معنی میں نہیں دے سکتی ہے۔

(۱۰) بائبل' ملوکیت اور مشرقی ظلم واستبداد سکھاتی ہے۔ مثلاً خدا سے ڈرو' بادشاہ کی عزت کرو۔" اور دنیا اب ملوکیت واستبداد کے اصول کو قائم نہیں رکھ سکتی۔

(۱۱) بائبل عورت کو ذلیل بتاتی ہے۔ حالانکہ ازروئے انصاف مرد وعورت دونوں کا درجہ مساوی ہونا لازم ہے۔

(۱۲) بائبل جنگ کی تعلیم دیتی ہے۔ حالانکہ دنیا کو امن وصلح کی ضرورت ہے۔

غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ مسیحی مذہب کے فنا ہونے کے چند درچند اسباب

تھے۔ ایک یہ کہ اس کی تعلیمات ترقی علوم وفنون کا ساتھ نہ دے سکتی تھی۔ دوسرے یہ کہ دنیا سے ملوکیت واستبداد کی رسم اٹھی اور اصول حکمرانی میں مذہب سے کوئی تعلق نہ رکھا گیا۔ تیسرے یہ کہ لوگوں نے اچھی طرح سمجھ لیا کہ بائبل سے ان کی زندگی کی کوئی ضرورت وابستہ نہیں ہے اور نہ وہ حیات انسانی کی جستجو کا شافی جواب دے سکتی ہے۔ اس کا تاریخی پہلو بالکل لغو۔ علمی پہلو بالکل مہمل ہے۔ اس کی اخلاقی تعلیم یکسر ناقابل محل ہے۔ وہی یوروپ جس نے مسیح اور تعلیم مسیح کی حمایت میں شدید ترین ظلم کرنے سے بھی باک نہ کیا تھا۔ آج اس کا یہ عالم ہے کہ وہ مسیح کو محض جاہل اور بائبل کو مجموعہ مزخرفات بتاتا ہے۔ وہ انجیل کی اس روایت کو دیکھتے ہیں جس میں یونس کا تین دن تین رات مچھلی کے پیٹ میں رہنا بیان کیا جاتا ہے' اور ہنستے ہیں اور علانیہ کہتے ہیں کہ مسیح کو دنیا اور قدرت کا اتنا علم بھی حاصل نہ تھا۔ جتنا آج ایک اسکول کے لڑکے کو حاصل ہے۔ نہ وہ تاریخ سے آگاہ تھے نہ جغرافیہ سے۔ نہ علم الحیات سے ان کو آگاہی تھی۔ نہ طبیعیات سے' نہ فلکیات کا علم انہیں حاصل تھا۔ نہ سیاسیات کا۔ رہ گئی تعلیم اخلاق سو اس کا یہ حال یہ ہے کہ نہ پہلے کبھی اس پر کوئی انسان عمل کر سکتا تھا نہ آج اس کا امکان ہے۔

فرض کیجئے گذشتہ جنگ کے موقع پر مسیح اتحادئین کی جنگی کونسل کے موقعہ پر موجود ہیں اور ان سے پوچھا جاتا ہے کہ دشمن کے ساتھ کیا سلوک کیا جائے۔ وہ کہتے ہیں "اپنے دشمن سے محبت کرو۔" دریافت کیا جاتا ہے' کیا ایسے دشمن سے محبت کی جا سکتی ہے جو سر سے پاؤں تک مسلح ہو کر گھر تباہ کرنے کے لئے کھڑا ہوا ہے' وہ فرماتے ہیں۔ "اگر کوئی تمہارے داہنے گال پر تھپڑ مارے تو دوسرا گال بھی سامنے کر دو۔" پھر پوچھا جاتا ہے کہ "دشمن کے تمام مظالم کا کیا علاج ہے؟" مسیح جواب دیتے ہیں "جو تم سے نفرت کرتے ہیں ان کے ساتھ بھلائی کرو۔ ان کے لئے دعائے خیر مانگو جو تم نے برا سلوک کرتے ہیں۔" کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ یہ عقل کی باتیں ہیں اور مسیح واقعی جنگ کونسل میں شریک ہو کر یہی تلقین کرتے تو ان کے ساتھ وہی سلوک نہ ہوتا جو کسی وقت یہودیوں اور اہل رومہ نے کیا تھا۔ کیونکہ مسیح کی یہ تلقین اخلاق آج بہ لحاظ سیاست و تجارت تمدن ومعاشرت ایسی لغو و ناقابل علم تعلیم ہے کہ اس سے زیادہ ناقص ذہن انسانی میں کوئی اور بات آہی نہیں سکتی۔

مسیح کہتے ہیں کہ "اگر کبھی ایک حقیر سی چڑیا بھی مر کر زمین پر گرتی ہے تو آسمانی باپ کا دل دکھ جاتا ہے۔" لیکن اگر واقعی کوئی آسمانی باپ ہے تو ہمیں حیرت ہوتی ہے کہ کیوں نہیں وہ ان تمام مظالم کو روکتا جو حقیر چڑیا کیا معنی بڑی بڑی انسانی ہستیوں کو تباہ کرتے رہتے ہیں۔

مسیح کا ارشاد ہے کہ "آسمانی باپ کے سر تمام بالوں کا شمار رکھتا ہے۔" لیکن ایک سائنس داں دریافت کر سکتا ہے کہ کیا وہ آسمانی باپ ان خوردبینی خلا کا بھی شمار رکھتا ہے' جو رحم کے اندر خدا معلوم کسی مقدس راہب کے تعمیر میں مصروف ہیں یا کسی قزاق ورہزن کی آفرنیش ہیں۔

مسیح فرماتے ہیں:۔ "ایک باپ اپنے بیٹے کو روٹی دینے پر قادر نہیں ہے۔ یہ آسمانی باپ ہی کا کام ہے جو مانگنے والوں کو دیتا ہے۔ اور ان کی دعائیں قبول کرتا ہے۔" لیکن آج تک نہیں دیکھا گیا کہ کسی مرنے والے کی ماں یا بیوی کی دعا جان بچانے میں مقبول ہوئی ہو یا کوئی بڑے سے بڑا راہب' مولوی یا ولی اس کا دعویٰ کر سکے کہ وہ اپنی دعا سے رائفل کی گولی راستہ میں روک لے گا۔ اب وہ زمانہ ہے جب دنیا اس حقیقت کو جان گئی ہے کہ اگر ہمارا رومال کثیف ہے تو اسے ایک پیسہ کا صابن ہی صاف کر سکتا ہے اور اگر سارے زمانہ کے اولیاء کرام اپنی تمام عمر محض اپنی دعا کی مدد سے اس کو صاف اور اجلا کرنے کی کوشش میں صرف کریں تو کامیاب نہ ہوں گے۔

مسیح کہتے ہیں :۔ آسمانی باپ کتنا مہربان ہے جو اچھے برے دونوں پر پانی برساتا ہے۔ حالانکہ علمی نقطہ نظر سے یہ امر کس قدر مضحکہ خیز ہے اگر واقعی پانی کا برسانا آسمانی باپ کے ہاتھ میں ہے تو وہ اپنے اس اختیار کو کس قدر بے اصولی سے استعمال کرتا ہے کہ جہاں ضرورت ہوتی ہے وہاں ایک قطرہ پانی کا نہیں گرتا۔ اور ہزاروں لاکھوں انسان قحط سے مر جاتے ہیں۔

مسیح کا نظریہ عفوودرگزر کے باب میں "سات ستر" بار کا ذکر ہے۔ یعنی ۴۹۰ مرتبہ انگلستان کا وزیر حربیہ (جنگ) مسیح سے پوچھتا ہے کہ "ہم ایک جرمن آبدوز کشتی کے کپتان کو جس نے ایک اسپتالی جہاز ڈبو دیا ہے کتنی مرتبہ معاف کریں؟ جواب ملتا ہے کہ "جب تک وہ ۴۹۰ اسپتالی جہاز ڈبوتا رہے۔" ایک حاکم عدالت دریافت کرتا ہے کہ "ایک

شخص کو جو اپنی بیوی کو بے قصور چھوڑ رہا ہے اور اس کے معاش کا کفیل نہیں ہوتا کتنی مرتبہ معاف کرکے رہا کریں کیا وہی اس کو مسیح کہتے ہیں "ہاں!"

وزیر حربیہ اور مجسٹریٹ دونوں یہ جواب سن کر اپنے ماتحتوں سے کہتے ہیں کہ "مسیح تو یوں ہی کہا کرتے ہیں۔ تم تو اس جرمن آبدوز کے کپتان کو فوراً گولی سے مار دو اور اس شخص کو جیل میں بند کر دو۔ جب تک ۳۰ پونڈ ماہوار بطور معاش اپنی بیوی کو دیتے رہنے کی ضمانت نہ داخل کر دے۔"

الغرض جس حد تک مذہبی معتقدات کا تعلق ہے۔ مسیحیت کا وجود دنیا میں باقی نہیں رہا' اور نہ موجودہ علمی وتمدنی ترقیوں کے زمانے میں اس کے باقی رہنے کی کوئی صورت تھی۔ اس وقت یوروپ وامریکہ کا اپنے آپ کو مسیحی یا عیسائی کہنا حقیقتاً ایک قومی یا نسلی تعین سے زیادہ کوئی مفہوم نہیں رکھتا اور نہ دنیا میں کوئی مذہب باقی رہ سکتا ہے۔ اگر وہ زمانہ کا ساتھ دینے کے لئے تیار نہیں اگر اس کی تعلیمات اس قدر وسیع جامع اور حاوی ہیں کہ ترقی ذہن وخیال کی رفتار کا ساتھ دے سکیں تو بے شک اس کا وجود باقی نہیں رہ سکتا ہے۔ ورنہ اس کے قائم رکھنے کی کوئی وجہ نہیں۔

اب ان تمام تمہیدی بیانات کے بعد آیئے مذہب اسلام پر غور کریں کہ اس کی حقیقت کیا ہے اور اس کے متعلق یہ دعویٰ کرنا کہ وہ مذہبی دنیا میں آخری لفظ کی حیثیت رکھتا ہے کس حد تک صحیح ہے۔

مذہب اسلام کی تعلیمی حقیقت معلوم کرنے کا ذریعہ قرآن ہے اور اس کے بعد محمد کی سیرت کہ ان دونوں میں اصولاً کوئی فرق نہ ہونا چاہیئے۔ ان دو ذریعوں کے علاوہ جو کچھ ہے یعنی احادیث کا مجموعہ اور مذہب اسلام کی تاریخ ان کو کوئی حقیقی یا معیار ذریعہ تحقیق کا نہیں قرار دیا جا سکتا۔ ان سے اگر کوئی کام لیا جا سکتا ہے تو صرف یہ کہ اسلام نے خیالات کی تبدیلی کے ساتھ ساتھ زمانہ کی کس قدر موافقت کی۔ لوگوں نے اسلام کا مفہوم میں کیا کیا تغیرات پیدا کئے اور یہ کہ اس میں حشونت وزواید کا اضافہ کب اور کن اسباب کے تحت ہوتا رہا۔

لیکن قبل اس کے کہ ہم اسلام کی تعلیمات سے بحث کریں مذہب کے مفہوم کو متعین کر لینا ضروری ہے۔

مذہب اگر انسان کے لئے کوئی ضروری چیز ہے تو دیکھنا چاہئے کہ یہ ضرورت محض فطرت کے اقتضاء سے پیدا ہوتی ہے یا صرف ماحول کے اثر سے۔

اس کا جواب دینے کے لئے زیادہ غور و تامل کی حاجت نہیں۔ ابتداء آفرینش سے لے کر اس وقت تک انسان کی تاریخ اس نتیجہ پر پہنچنے میں مدد کرتی ہے کہ مذہب کا خیال بڑی حد تک فطری اقتضاء ہے اور محض اس لئے کہ انسان باطلب تمدن پسند ہے اور تمدن کا نظام بہت کچھ منحصر ہے۔ کسی اعتقادی قانون پر یہ ضرور ہے کہ ماحول کے اثر سے مذہبی خیالات میں تغیر و تبدل ہوتا رہتا ہے۔ لیکن مذہب کا خلاق ماحول نہیں ہے بلکہ فطری اقتضاء رہے۔

اس لئے ایک مذہب کے بہترین ہونے کی علامت اگر کوئی ہو سکتی ہے تو صرف یہ کہ وہ اصولاً فطرت کے مطابق ہو یعنی فطرت انسانی اپنے اکتسابات کے لحاظ سے جس قدر ترقی کرتی جائے۔ مذہب نہ صرف یہ کہ اس کا ساتھ دے بلکہ ہمیشہ ترقی کا ایک بلند نصب العین سامنے رکھے یہ ایک ایسا اصول کسی مذہب پر نقد کرنے کا ہے کہ اس کی صحت سے غالباً کسی کو انکار نہیں ہو سکتا۔ اچھا تو آیئے سب سے پہلے اسی کو سامنے رکھ کر اسلام کی جانچ کریں کہ وہ کس حد تک اس معیار پر پورا اترتا ہے۔

قرآن میں مذہب اسلام کی حقیقت جن الفاظ میں بیان کی گئی یہ ہیں :۔

"فطرۃ اللہ التی فطرالناس علیہا ولاتبدیل لخلق اللہ ذالک الدین لقیم۔"

یعنی اسلام نام ہے صرف اس فطرت الٰہی کا جس پر انسان پیدا ہوا ہے اور فطرت الٰہی یہ ہے کہ جو قانون نظام عالم کا اس نے بنایا ہے۔ اس میں تبدیلی پیدا نہیں کرتا اور یہی مسلک و مذہب ایسا ہے جو ہمیشہ قائم رہنے والا ہے ان چند الفاظ میں جو فلسفہ مذہب کا بیان کیا گیا ہے۔ وہ اس قدر حاوی اور ایسا مکمل ہے کہ زمانہ خواہ کتنی ہی ترقی کرے اس کی صداقت سے انکار نہیں ہو سکتا۔ اس میں ظاہر کیا گیا ہے کہ :۔

مذہب اسلام فطرت انسانی کا ساتھ دینے والا ہے اور اس بام ترقی پہنچانے والا ہے جو انسان کے تمام قواء کامنہ کا بروئے کار لانے کے بعد بہ آسانی حاصل ہو سکتا ہے۔ پھر اسی کے ساتھ یہ بھی ظاہر کر دیا ہے کہ ترقی کے اصول کیا ہیں؟ یعنی اس کلیہ کو ہمیشہ سامنے

رکھنا کہ جو اصول نظام عالم اور ارتقاء کا قدرت نے مقرر کر دیا ہے۔ اس میں کبھی تبدیلی پیدا نہیں ہو سکتی اور ایک انسان کا فرض ہے کہ ہمیشہ سعی و کوشش سے کام لے کر ترقی کی راہیں پیدا کرے۔ اسی اصول کو خدا نے کہیں آیات محکمات کہا ہے کسی جگہ "لن تجد لسنتہ اللہ تبدیلا" سے تعبیر کیا ہے۔ کبھی "بصائر للناس" بتایا ہے اور کبھی حبل اللہ سے اس کی صراحت کی ہے۔

اسی کے ساتھ یہ بھی ظاہر کر دیا گیا ہے کہ اگر انسان اس حقیقت کو سمجھ کر کاربند ہوا اور وہ اس حقیقت کو سمجھ لے کہ "لیس الانسان الا ما سعی" (ایک شخص کو اتنا ہی ملے گا یقینی وہ کوشش کرے گا) تو پھر اس کا نتیجہ کیا ہوگا۔ ترقی کی صورت کیا ہوگی۔ ارشاد ہوتا ہے کہ :۔ "وعداللہ الذین آمنوا منکم وعملوا الصلحت لیستخلفنھم فی الارض" یعنی اگر لوگوں نے مقررہ اصول حیات و ترقی کا یقین کر لیا۔ اور انہوں نے اس پر کاربند ہو کر سعی و کوشش کی تو ہمارا وعدہ ہے کہ ہم ان کو زمین میں اپنا خلیفہ بنا دیں گے۔ کرہ ارض کا وارث کر دیں گے اور وہ نائب خدا ہونے کی حیثیت سے زبردست اقتدار و حکومت کے مستحق قرار پائیں گے۔

یہ ہے اصل روح اس تعلیم کی جو مذہب اسلام نے دنیا کے سامنے پیش کی۔ اور دعویٰ کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ اس سے زیادہ علمی تعلیم نہ اس سے قبل کسی مذہب نے دی اور نہ آئندہ اس میں کسی اضافہ کی گنجائش ہے۔

اسلام کی اولین شرط توحید ہے لیکن چونکہ عام طور پر اس کا مفہوم غلط سمجھا جاتا ہے۔ اس لئے مختصراً اس کا ذکر بھی ضروری ہے۔ آپ جس مولوی سے پوچھئے گا کہ توحید کسے کہتے ہیں۔ وہ یہی جواب دے گا کہ خدا کو ایک ماننا توحید ہے۔ حالانکہ اس مفہوم کی غلطی سے ظاہر ہے کہ جب خدا کو زمان و مکان سے بے نیاز مانا جاتا ہے تو اس کو ایک کیسے کہہ سکتے ہیں؟ جب کہ ایک کے مفہوم میں زمان و مکان دونوں شامل ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ ایک کا مفہوم لوگوں نے بالکل غلط لیا ہے۔ وہ مفہوم ہے جو لفظ کل سے ظاہر کیا جا سکتا ہے' اسی لئے میرے نزدیک خدا کا کوئی موزوں و مناسب نام ہو سکتا ہے تو وہ صرف کل ہے اور اسی کو اس کا اسم اعظم قرار دینا چاہئے۔ یہ مفہوم خدا کا ایسا ہے جس میں نہ کبھی شائبہ شرک پیدا ہو سکتا ہے' اور نہ وہ صورتیں جو عام طور پر

شرک سمجھی جاتی ہیں داخل شرک ہو سکتی ہیں۔

خدا کو کل سمجھنا' یعنی اس کا تمام کائنات کا محیط اعظم' دائرہ کونین کا مرکز حقیقی موجودات کا خالق اصلی' عالم اسباب کا علۃ العلل قرار دینا یہی مفہوم ہے۔ اسلام کی توحید کا اور یہی مدعا ہے صوفیاء کی وحدت الوجود کا۔ لیکن فرق یہ ہے کہ صوفیاء نے وحدت الوجود کو خوارق عادات اور کرامات کی بنیاد قرار دے کر اپنے آپ کو عضو بیکار بنالیا اور سائنس نے اس کل کو مظاہر جزئیات سمجھنے کی کوشش کی اور صحیح معنے میں علم "خلیفتہ اللہی" بلند کیا۔

میں ہرگز یہ ماننے کے لئے تیار نہیں کہ اگر کوئی شخص بت پرستی کرتا ہے تو وہ شرک میں مبتلا ہے۔ کیونکہ بت پرستی حقیقتاً اسی کل کے مختلف مظاہر و آثار کا مطالعہ ہے اور دنیا میں کوئی ایسا شخص نہیں جو یہ سمجھتا ہو کہ تمام کاموں کا انحصار حقیقتاً انہیں پتھر کی مورتوں پر ہے۔

خدا کے مفہوم کے تعین میں سب سے بڑی غلطی ہر جگہ اور ہر زمانہ میں ہوئی ہے کہ اس دنیا کے انسانی بادشاہ کی طرح پیش کیا گیا جو خوش بھی ہو سکتا ہے اور برہم بھی۔ حالانکہ ان دونوں کا اطلاق اس پر نہیں ہو سکتا' اگر کوئی شخص جو خدا کو گالیاں دے تو وہ برہم ہو کر اپنے قانون کو نہیں بدل سکتا۔ اور اگر کوئی ہر وقت سجدہ میں ہی پڑا رہے تو خوش ہو کر اس کی سعی سے زیادہ نہیں دے سکتا۔ اس لئے یہ سمجھنا کہ اگر کوئی قوم بتوں کے سامنے جھکتی ہے۔ متعدد خداؤں کی قائل ہے تو وہ صرف اسی وجہ سے عنداللہ مغضوب ہے۔ درست نہیں۔ البتہ اگر اس کی بت پرستی یا شرک اسے اوہام باطلہ میں مبتلا کر کے اس نصب العین سے ہٹا دینے والے ہیں جو خدا کو واحد یا کل ماننے کی حالت میں سعی و عمل' کاوش و جستجو' اقدام و ترقی کی صورت میں رونما ہوتا ہے تو بے شک ہم کہہ سکتے ہیں کہ فطرت اس سے برہم ہے اور اس کی برہمی یہی ہے کہ ہم دنیا میں ذلیل و حقیر ہیں۔ اور غلامی و اسیری کی زندگی بسر کریں۔

"انتم الاعلون ان کنتم مومنین" (تم کو بلند مرتبہ والا ہونا چاہئے اگر تم مومن ہو)۔ اسلام کی تعلیم ہے اور یہیں سے ایمان کی حقیقت واضح ہوتی ہے۔ اور اس توحید کی جو ایمان کی بنیاد ہے۔ فرض کیجئے ایک شخص تمام عمر خدا کے ایک ہونے کا وظیفہ

رٹتا رہے۔ لیکن وہ اس کے حقیقی مفہوم سے ناآشنا ہوتے ہوئے' سوا مسجد میں اذان دینے کے اور کچھ نہ کرے تو کیا ایسے انسان کو ان مومنوں میں شامل کر سکتے ہیں۔ جن کے ایمان کا نتیجہ لازمی اقتدار و مرتبہ بلند بتایا گیا ہے۔

اس لئے اگر ایمان واسلام کی بنیاد توحید ہے تو اس توحید کے معنی یہ نہیں ہیں کہ خدا کو ایک سمجھا جائے بلکہ اس کو محیط کل باور کیا جائے۔ اصول فطرت کا مطالعہ کیا جائے۔ عالم اسباب پر نگاہ ڈالی جائے۔ اجتہاد و عمل کو معمول بنایا جائے۔ دماغی وذہنی قوتوں سے کام لیا جائے اور کائنات کو مسخر کر لیا جائے۔

چنانچہ صراحۃ" بیان ہوتا ہے کہ :-

"وسخر لکم مافی السموت وما فی الارض جمیعا منہ ان فی ذالک لایات لقوم یتفکرون"

آسمان و زمین میں جو کچھ ہے وہ سب تمہارے سے تابع فرمان ہے۔ لیکن شرط یہی ہے کہ تم غور و فکر' تامل و تدبر' سعی و کاش سے کام لو۔ پھر دیکھو کہ کیا بحرو بر کی تسخیر انسان کے لئے ناممکن ہے' کیا جبال وانہار پر آج انسانی اقتدار نہیں پایا جاتا۔ پانی' ہوا' آگ' بجلی' بادل' فضا' روشنی' حرارت' ہوا کے طیور' زمین کو چوپائے' پہاڑوں کے معدنیات' پانی کے حیوانات الغرض دنیا میں کوئی چیز' کوئی کیفیت کوئی قوت ایسی نہیں ہے جو انسان کے اقتدار سے باہر ہو۔ لیکن کیا دنیا کا کوئی مذہب اس کا دعویٰ کر سکتا ہے کہ اس نے انسان کی ان جملہ ذہنی ترقیوں کا درس اسی طرح کھلے ہوئے الفاظ میں دیا ہے جیسا قرآن میں پایا جاتا ہے۔ اسلام نام ہے صرف قرآن کی تعلیمات پر عمل کرنے کا۔ اس لئے ہر وہ جماعت جو اس کی عامل ہے مسلمان کہلائے گی۔ خواہ وہ مسیح کی اولاد میں ہو یا دام و کچھمن کی ذریات میں سے اور جو اس پر عامل نہیں ہے' وہ یقیناً کافر' مشرک اور غیر مسلم کہلائے گی' خواہ وہ آل فاطمہ ہی سے کیوں نہ نسبت رکھے۔ یہ ہے قرآن کا فیصلہ آخر جو اس نے ایک مسلم وکافر کی تفریق وامتیاز کے متعلق سب کو سنا دیا ہے اور جس میں کبھی تبدیلی کی ضرورت نہیں ہو سکتی۔ خواہ انسانی ذہن وتمدن کتنی ہی ترقی کیوں نہ کر جائے۔

آپ تمام قرآن کو دیکھ ڈالئے۔ ایک ایک آیت' ایک ایک لفظ کی چھان بین کر لیجئے۔ ہر جگہ تعلیم کی یہی عمومیت درس کا یہی احاطہ کامل اور تہذیب عمل کی یہی ہمہ

گیری نظر آئے گی۔ عبادات کی تعلیم، صلاح و تقویٰ کا درس، غور و تامل کی ہدایت۔ تفکر وتدبر کی تاکید، الغرض ہر ارشاد اسی ایک اصول ترقی پر منحصر ہے اور کسی جگہ رسمی، ظاہری بے معنی طاعت کو مقصود قرار نہیں دیا گیا۔ نماز میں بھی اس وحدت عمل کو مقصود قرار دیا گیا۔ نماز میں بھی اسی وحدت کا نظارہ ہے، روزہ میں بھی اسی احساس انسانیت کی تعلیم ہے۔ زکوٰۃ میں بھی وہی تعاون وہمدردی کا سبق ہے۔ حج میں بھی وحدت عمل مقصود ہے اور جہاد نفس ومال اسی محنت وجفاکشی، اسی ایثار وقربانی کی تعلیم ہے جو اساس ارتقاء اور بنیاد اخلاق ہے۔

اس سے قبل ہم بیان کر چکے ہیں کہ سب سے زیادہ صدمہ مذاہب کو جس چیز سے پہنچا وہ ڈارون کا اصول ارتقاء (Evolution) تھا۔ لیکن اسلام اس لحاظ سے بھی تمام مذاہب سے ممتاز نظر آتا ہے۔ کیونکہ سب سے پہلے جس نے اس مسئلہ کی حقیقت پر گفتگو کی وہ اسلام ہی کا پیرو ابونصر محمد فارابی تھا اور ڈارون سے بہت قبل ابن سینا، ابن باجہ اور ابن مسکویہ (حکماء اسلام) ہی تھے۔ جنہوں نے اصول ارتقاء کو بڑی حد تک مدون کیا۔

ممکن ہے آج مولوی اس کو بھی کفر والحاد کہے اور قدیم حکماء اسلام کو کافر وملحد کے خطاب سے یاد کرے۔ لیکن میں دیکھتا ہوں کہ قرآن میں خود اس مسئلہ کے مختلف مدارج واصول کی طرف اشارہ پایا جاتا ہے۔ آج چونکہ ڈارون کے نام سے یہ نظریہ منسوب کیا جاتا ہے۔ اس لئے مسلمانوں کو اس کے قبول کرنے میں پس وپیش ہوتا ہے۔ علماء کرام اس کی تضحیک کرتے ہیں حالانکہ اگر نظر وسیع ہوتی تو ان کو معلوم ہوتا کہ اس نظریہ کے دریافت کا فخر بھی فرزندان اسلام ہی کو حاصل ہے اور خود قرآن میں جابجا اس حقیقت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے:۔

۱۔ "ربنا الذی اعطےٰ شئی خلقه ثم ہدیٰ"

(میرا خدا وہ ہے جس نے ہر چیز کو اس کی فطرت وجبلت عطا کی اور پھر ترقی کی طرف مائل کیا)

۲۔ "لیس للانسان لاماسعی۔ رفع بعضکم فوق درجات۔"

کیا تنازع للبقا اور صلاحیت کے لحاظ سے۔ مختلف درجات قیام کی تعیین اور بقاء اصلح کو ان سے بہتر الفاظ میں بیان کیا جا سکتا ہے۔ کیا قرآن مجید میں مومنین، مسلمین، صالحین،

قانتین وغیرہ کے جو سینکڑوں الفاظ آئے ہیں وہ افراد اصلح کو ظاہر نہیں کرتے اور کیا (Survival of The Fittest) کا کوئی اور مفہوم ہو سکتا ہے۔

۳۔ "ہوالذی انشاء کم من نفس واحدۃ فمستقر و مستودع"
کیا موجودہ علم الحیات کا یہ مسئلہ کہ آفرینش کا سلسلہ صرف ایک نفس سے ہوا ہے جسے (Proton) بھی کہتے ہیں' کوئی دوسری چیز ہے کیا لفظ مستقر سلسلہ آفرینش کے مختلف مدارج کو ظاہر نہیں کرتا اور کیا مستودع سے سلسلہ آفرینش کی آخری مکمل کڑی (انسان) کی طرف اشارہ نہیں ہے۔

الغرض نظریہ ارتقاء کا کوئی اصول ایسا نہیں ہے جس کی طرف قرآن نے رہبری نہ کی ہو۔ اور اس لئے تمام مذاہب عالم میں اسلام ہی ایک ایسا مذہب ہے جو علم و حکمت کے اس محکم ترین نظریہ کا ہم آہنگ نظر آتا ہے اور پھر ایک اسی مسئلہ پر کیا موقوف ہے تمام وہ مسائل جو اساسی طور پر کسی نہ کسی نہج سے مذہب کے متصادم ہو سکتے ہیں۔ سب کے لئے قرآن میں بہترین اشارات پائے جاتے ہیں اور ایسے مستحکم و مضبوط کہ ذہن انسانی اپنے بلند ترین نقطہ عروج پر پہنچنے کے بعد اس میں تزلزل پیدا نہیں ہو سکتا۔

فلکیات میں بطلیموس اور ارسطالیسی نظام کی تردید سب سے پہلے جس نے کی وہ قرآن ہی تھا کہ اس نے ان اجرام کو کل فی یسبحون" کہہ کر یہ بتایا کہ سب کے سب اپنے مدار پر گردش کر رہے ہیں۔ اس کے بعد کوپرنیکی نظام ہوا جس میں غلطی سے سورج کو اپنی جگہ ساکن مانا گیا۔ پھر ایک زمانے کے بعد ہرشل نے گزشتہ صدی میں ثابت کیا کہ آفتاب مع اپنے تمام سیارگان کے خود کسی اور چیز کا طواف کر رہا ہے۔ حالانکہ قرآن اس سے بہت قبل اس حقیقت کا اظہار کر چکا ہے کہ "والشمس تجری لمستقرلہا" اسی طرح علوم جدیدہ کے اور بہت سے اساسی مسائل ایسے ہیں جو تعلیمات قرآنی کے احاطہ سے باہر نہیں ہیں اور اس لئے اگر یہ دعویٰ کیا جائے کہ اسلام ہی ایک مذہب ہے جو ہر زمانہ کی ترقی کا ساتھ دے سکتا ہے تو یہ دعویٰ غالباً غلط نہ ہوگا۔

اب رہ گئی اس کی اخلاقی تعلیم جو حقیقتاً اساس تہذیب و تمدن ہے سو اس کے متعلق غالباً مخالفین کو بھی انکار نہ ہوگا کہ اسلام سے زیادہ عملی درس دینے والا اور زندگی کو یکسر اضطراب عمل ثابت کرنے والا کوئی اور مذہب نہیں ہے۔ دنیا میں اسلام ہی ایک ایسا

مذہب ہے جس کی بنیاد نہ خرافیات پر ہے' نہ ضمیات پر' نہ جس کا انحصار اساطیر الاولین کے ماننے پر ہے۔ نہ کسی مخصوص رسم ورواج اور طریق عبادت دنیالیش پر' اس نے صرف ایک تعلیم دی ہے کہ دنیا میں آئے ہو تو کائنات پر غور کرو۔ مظاہر قدرت کا مطالعہ کر کے اپنی ان قوتوں کو بروئے کار لاؤ جو تمہارے اندر ودیعت کر دی گئی ہیں' نظام تمدن میں ایک عضو مفید کی حیثیت پیدا کرو۔ ابنائے جنس کے ساتھ ہمدردی کرو۔ اور اپنی سعی وکوشش سے دنیا کو اپنے لئے فردوس بنالو۔ پھر جو شخص اس اصول پر کاربند ہے وہ حقیقتاً اسلام ہی کے اصول پر کاربند کہلائے گا۔ خواہ وہ کسی رنگ ونسل کا ہو اور اس پر عامل نہیں ہے اس کو مسلمان کہلائے جانے کا کوئی حق حاصل نہیں۔ خواہ حطیم کعبہ ہی کے اندر اس کی ماں نے کیوں نہ اس کو جنا ہو۔

نماز اصولاً درس اجتماع ہے' زکوٰۃ اصولاً جذبہ تعاون ہے' روزہ اصولاً حسیات لطیف کی بیداری ہے۔ اور حج اخوت وانسانیت کا احساس ہے وسیع پیمانے پر۔ اس لئے اگر قوم کو ایک شیرازہ میں منسلک کرنے کے لئے ان کے لئے مخصوص قواعد مرتب کئے جائیں تو تعلیم الٰہی کے منافی نہیں ہو سکتا۔ لیکن چونکہ یہ تمام قواعد وضوابط صرف سوسائٹی سے متعلق ہیں اور انسانی معاشرت کو اسلوب بلند پر لانے کے لئے ہمیشہ ایسے قانون مرتب کئے جاتے ہیں جو جماعت کے افراد میں باہم انتشار خیال واختلاف واعمال کے امکانات کو دور کر کے ہیئت اجتماعی کو متاثر نہ ہونے دیں۔ اس لئے یہ بالکل یقینی ہے کہ آج کا بنایا ہوا قانون کل اور کل کا بنایا ہوا پرسوں کام نہیں دے سکتا اور اس میں زمانہ وملک کے لحاظ سے تبدیلی ضروری ہے۔ یہی وہ نکتہ ہے جس کو ہمارے علمائے کرام نے نہیں سمجھا۔ اور یہی مسئلہ میرے ان کے درمیان استخوان جنگ بنا ہوا ہے۔

وہ کہتے ہیں کہ اسلام اور اسلامی فقہ ایک چیز ہے۔ میں کہتا ہوں کہ ان دونوں میں بہت فرق ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اسلام نام ہے صرف ایک مخصوص طریقہ سے عبادت کرنے کا۔ مقررہ قواعد کے تحت روزہ رکھنے کا۔ تعین مقدار کے ساتھ زکوٰۃ ادا کرنے کا' میں کہتا ہوں کہ یہ طریقے اور قاعدہ اصل چیز نہیں بلکہ ہر زمانے کے لحاظ سے بدل جانے کی چیزیں ہیں۔ اس لئے ان پر زیادہ زور دینے کی ضرورت ہے اور نہ ان کو مذہب میں داخل کرنے کی۔ بلکہ اگر آج ترقی تمدن ضروریات معاشرت' اقتضاء مشاغل یا کسی اور

مصلحت کی بناء پر جس کی رعایت ہماری دنیوی فلاح کے لئے ضروری ہے۔ فقہ کو بدل ڈالنا اصول عبادت میں تغیر و تبدل کر دینا۔ ضابطہ معاشرت میں ترمیم و تنسیخ کر دینا' مناسب ہو تو ایسا کر دینا چاہئے اور یہی اولین فرض ہے ایک ذی شعور عالم دین کا' ایک صاحب فہم اخلاقی رہبر کا اور ہر اس ہادی مذہب کا جو اسلام کے صحیح مفہوم سے آشنا ہے' اگر یہ کہا جائے کہ ایسا کرنا تحریف ہوگی اور اس سے قبل کبھی ایسا نہیں ہوا تو دعویٰ بالکل غلط ہوگا۔ کیونکہ اگر اختلاف نہ ہوتا تو آج حنبلی فقہ' حنفی فقہ' شافعی فقہ کی کیوں تفریق ہوتی۔ اشاعرہ و معتزلہ کی جماعتیں کیونکر پیدا ہوتیں' قرون اولیٰ میں تاویلات کا دروازہ کیوں کھلتا اجتہادات و قیاسات میں کیوں اختلاف ہوتا اقوال آئمہ مجتہدین میں اس قدر اصولی اختلاف کیسے پیدا ہوتا کہ آج یقین کے ساتھ یہ کہنا بھی دشوار ہے کہ رسول اللہ واقعی ہاتھ باندھ کر نماز پڑھا کرتے تھے یا ہاتھ کھول کر۔

ظاہر ہے کہ کسی مذہب کی بنیاد وہ مسائل نہیں ہوا کرتے جن میں لوگوں کے اختلاف کو گوارا کیا جا سکتا ہے۔ بلکہ اساس مذہب صرف وہ مقصود ہوتا ہے مرکزی حیثیت رکھتا ہے اور جس سے کسی کو اختلاف نہیں ہو سکتا۔ پھر مذہب اسلام کا اساسی اصول صرف ایک ہے۔ جسے قرآن مین ہر جگہ ظاہر کیا گیا ہے کہ دنیا میں اخوت عامہ وانسانیت کے رشتہ کو مضبوط کرو۔ اور ہر ممکن ترقی کے حصول پر آمادہ ہو جاؤ۔ اگر اس سے کسی کو اختلاف ہو تو بے شک ہم کہیں گے کہ وہ اسلام سے خارج ہے انسانیت سے علیحدہ ہے۔ لیکن جب تک کوئی شخص اس اصول تعلیم کو مان رہا ہے اور اس پر عامل ہے۔ اس وقت تک کسی کو حق حاصل نہیں ہے کہ وہ اسے دائرہ مذہب سے خارج کر دے خواہ وہ نماز کا عادی ہو یا نہ ہو۔ روزہ رکھتا ہو نہ رکھتا ہو' یہ درست ہے کہ قرآن میں ان شعائر اسلامی کی پابندی کا ذکر موجود ہے۔ لیکن صرف ایک مختص الوقت و مختص المقام قانون کی حیثیت سے اور آج اگر ضرورت ہو تو ان کو بدلا جا سکتا ہے۔ بغیر اس کے کہ قرآن مجید کی عظمت کو اس سے صدمہ پہنچنے کا اندیشہ کیا جائے۔

حقیقت سے ہٹ کر فروع کو اصل قرار دینے کی داستان بہت طویل ہے۔ اگر اس کی تاریخ کا سراغ لگایا جائے تو معلوم ہوگا کہ اس کی بنیاد عہد سعادت کے ختم ہوتے ہی پڑ گئی تھی۔ لیکن بعد اس میں اس میں اور اضافے ہوتے گئے۔ گمراہیوں میں اشتداد ہوتا رہا'

صراط مستقیم سے ہٹنے کے بعد زیادہ پیچ در پیچ راہوں میں الجھتے گئے۔ یہاں تک آج اسلام کا مفہوم ہی بالکل بدل گیا اور وہ انسانیت کی سطح بلند سے گر کر رسم ورواج اور اوہام باطلہ' عقائد سخیفہ' مفروضات رویہ اور مزعومات کاذبہ کا مجموعہ ہو کر رہ گیا ہے اور چونکہ گمراہی شدید ہے ضلالت سخت ہے' اور اسلام کا درس اولین دماغ سے بالکل محو ہو چکا ہے۔ اس لئے جو صحیح بات بتائی جاتی ہے تو اس کو بھی غلط سمجھا جاتا ہے اور عرصہ تک تاریکی میں رہنے کی وجہ سے روشنی سے آنکھیں خیرہ ہونے لگتی ہیں۔

اسلام وایمان نام تھا صرف اتحاذ امت کا۔ نفسی ومالی جہاد کا۔ سعی وعمل کا' مکارم اخلاق کا' سیروانی الارض کا اور کفر کہتے تھے صرف افتراق امت کو' جہاد سے جی چرانے کو' محنت دکوشش سے منحرف ہونے کو۔ اصول اخلاق سے ہٹ جانے اور پاؤں توڑ کر ایک جگہ بیٹھ جانے کو۔ لیکن اب اسلام ہے نام صرف تسبیح وعمامہ کا' جبہ و دستار کا' رسمی نماز ادا کر لینے کا اور سر منڈا کر رسماً" و تقلیداً حرم کے طواف کر لینے کا۔ اسی طرح کفر کا مفہوم یہاں تک وسیع ہو گیا ہے اگر آج میں کسی مولوی سے فلسفہ عبودیت پر بحث کر کے نماز کی حقیقت دریافت کرنا چاہتا ہوں تو وہ مجھے کافر' ملحد' فاسق وفاجر کہہ کر نکال دیتا ہے۔

بہرحال دنیا کو ایک نظام کی ضرورت یقیناً ہے۔ کیونکہ جامعہ بشری اس کا محتاج ہے۔ اخلاق کی تعلیم کے لئے کسی نہ کسی ایسی بنیاد کی ضرورت ہے جو سوسائٹی کے قوانین لوگوں پر عائد کر سکے وہ نظام اگر کوئی ہو سکتا ہے تو وہ صرف اسلام ہے۔ جس کی آغوش ساری دنیا کے لئے کھلی ہوئی ہے اور جس کی تعلیمات فطری ہر ملک اور ہر زمانے کے لئے موزوں ومناسب ہو سکتی ہیں۔

اس کے بعد غالباً یہ فیصلہ کر لینا دشوار نہیں کہ دنیا میں یاجوجی قوت کون سی ہو سکتی ہے وہ جو اپنی تنگ نظری سے خود اپنے افراد کو بھی علیحدہ کر رہی ہے یا وہ جو ساری دنیا کو دعوت دے کر ایک مرکز پر ایک غرض مشترک کے ساتھ جمع کرنا چاہتی ہے۔

O OO OO